Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

یکم و ۱۶ نومبر ۲۰۲۴ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۷ ـ شمارہ نمبر: ۲۱ـ۲۲

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ـ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ـ ۳۵، بلاک ـ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ـ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱ـ۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱ـ۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱ ـ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے' جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔
۲ ـ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون' نقطہ نظر' خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں' اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جاسکتی ہے۔
۳ ـ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔
۴ ـ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید' لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔
۵ ـ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

'دریا سے سمندر تک'... فلسطین

اروندھتی رائے

میں 'پین برطانیہ' اور جیوری کے اراکین کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ مجھے اس سال 'پین پنٹر' ایوارڈ کا حق دار قرار دیا گیا۔ اپنی گفتگو کا آغاز اس 'مینارۂ جرأت' کے نام سے کروں گی، جن کے ساتھ میں نے اپنا ایوارڈ بانٹنے کا فیصلہ کیا ہے۔ علاء احمد عبدالفتح (پ: نومبر ۱۹۸۱ء) اس ایوارڈ میں میرے شریک ہیں۔ ہم پُرامید تھے اور دُعا کر رہے تھے کہ آپ اس سال ستمبر میں آزاد ہوں گے، لیکن مصر کی حکومت نے آخرکار یہی فیصلہ کیا کہ آپ اتنے 'شان دار' مصنف اور ایسے 'خطرناک' مفکر ہیں کہ آپ کو آزاد کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا۔ لیکن آپ آج اس ہال میں ہمارے ساتھ ہیں اور آپ یہاں پر موجود لوگوں میں سب سے اہم ہیں۔ آپ نے جیل خانے سے لکھ بھیجا ہے کہ ''میرے الفاظ اثر کھو چکے ہیں، لیکن میں لکھ رہا ہوں۔ اگرچہ سننے والے چند ہی ہیں اور میں بول رہا ہوں''۔

ہم سن رہے ہیں علاء، بہت غور سے!

آپ سب جو یہاں آئے ہیں، آپ سب کو میرا اسلام اور ان کو بھی جو حاضرین کو تو شاید نظر نہ آئیں، لیکن میری نظریں انہیں بالکل ایسے ہی دیکھ رہی ہیں، جیسے یہاں پر موجود لوگوں کو۔ میرا اشارہ بھارتی جیلوں میں قید میرے دوستوں اور ساتھیوں کی طرف ہے، جن میں وکیل بھی ہیں، اور اساتذہ بھی، طلبہ بھی ہیں اور صحافی بھی۔ میں عمر خالد، گل فشاں فاطمہ، خالد سیفی، شرجیل امام، رونا ولسن، سریندرا گیڈلنگ، مہیش راوت کی بات کر رہی ہوں۔ خرم پرویز میرے دوست! میں تم سے مخاطب ہوں۔ تم انتہائی خوب صورت لوگوں میں سے ایک ہو، لیکن جیل کی دیواروں نے تمھیں تین سال سے اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔ عرفان مہراج میں تمھیں بھی یاد کر رہی ہوں اور ان ہزاروں خاک نشینوں کو بھی جو کشمیر یا ملک بھر (بھارت) کی جیلوں میں قید، متاعِ حیات لٹا رہے ہیں۔

جب پین برطانیہ کی مہتمم اور پنٹر جیوری کی رکن، رُتھ بورتھویک نے اس اعزاز سے متعلق پہلی بار مجھ سے بات کی تو انہوں نے لکھا تھا کہ 'پنٹر پرائز' ایسے مصنّفین کو دیا جاتا ہے جو ''اٹل سچائی، غیر متزلزل اور فکری عزم کے ساتھ ہماری زندگی اور معاشرے کی اصل حقیقتوں'' کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات ہرلڈ پنٹر نے نوبیل انعام کے حصول کے وقت تقریر میں کہی تھی۔

'غیر متزلزل' کے لفظ نے مجھے سوچ میں ڈال دیا کیوں کہ میں خود ہمیشہ متزلزل رہتی ہوں۔ میں ان دو الفاظ، متزلزل اور غیر متزلزل پر کچھ مزید بات کرنا چاہوں گی۔ اس لفظ کی شاید سب سے بہتر وضاحت ہیرلڈ پنٹر نے ہی کی تھی:

میں ۱۹۸۰ء کے عشرے میں لندن کے امریکی سفارت خانے میں موجود تھا۔ امریکی کانگریس، ریاست نکاراگوا کے خلاف سرگرم مسلح باغیوں 'کونٹراز' (Contras) کو مزید رقم کی فراہمی کے متعلق فیصلہ کرنے والی تھی۔ میں نکاراگوا کے نمائندہ وفد میں شامل تھا، لیکن ہمارے وفد کا اہم ترین حصہ ایک پادری جان میٹکاف تھے۔ امریکی کمیٹی کے سربراہ Raymond Seitz تھے (جو اس وقت نائب سفیر تھے، اور بعد میں سفیر بنے)۔ پادری میٹکاف نے کہا، 'جناب میں شمالی نکاراگوا کے ایک مذہبی حلقے کا منتظم ہوں۔ وہاں اہل علاقہ نے مل کر ایک مدرسہ، شفاخانہ اور پنچایت گھر تعمیر کیا تھا۔ ہم امن و سکون کے ساتھ رہتے آئے ہیں، لیکن کچھ مہینے پہلے باغیوں نے حملہ کر کے مدرسہ، شفاخانہ اور پنچایت گھر سمیت ہر شے تباہ کر دی۔ انہوں نے نرسوں اور استانیوں کی آبروریزی کی اور ڈاکٹروں کو انتہائی دردناک طریقے سے ذبح کر دیا۔ ان کا رویہ بالکل وحشیانہ تھا۔ آپ براہ مہربانی امریکی انتظامیہ سے درخواست کریں کہ وہ ان دہشت گردوں کی حمایت سے پیچھے ہٹ جائے۔

ریمنڈ سیٹز ایک سلجھے ہوئے آدمی کے طور پر جانے جاتے تھے۔ سفارتی حلقوں میں ان کی بڑی عزّت تھی۔ انہوں نے یہ بات سنی، کچھ دیر خاموش رہے اور پھر گہری آواز میں بولے: 'پادری صاحب! آج میں آپ کو کچھ بتاتا ہوں۔ معصوم لوگ ہمیشہ سے جنگ کا ایندھن بنتے آئے ہیں۔' برف جیسی منجمد خاموشی کے ساتھ، ہم ان کی طرف دیکھتے رہے لیکن سفیر صاحب ذرا بھی 'متزلزل' نہ ہوئے۔

یاد رہے (۴۰ ویں) امریکی صدر رونالڈ ریگن (م: ۲۰۰۴ء) ان باغیوں کو 'اخلاقی طور پر امریکی بانیانِ قوم کے ہم پلّہ' قرار دے چکے تھے اور یہ اصطلاح انہیں خاصی پسند تھی۔ انہوں نے افغان مجاہدین کے لیے بھی یہی اصطلاح استعمال کی تھی، جو پھر طالبان بن گئے۔ یہی طالبان امریکی

اندرونی صفحات پر

- اسرائیل پر عالمی ایف آئی آر
- یورپ کس طرف جا رہا ہے؟
- ٹرمپ کی علاقائی تبدیلیاں
- اونروا پر ممکنہ اسرائیلی پابندی کے اثرات؟
- امریکی صدر جس نے اسرائیل کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا
- غزہ: منظّم نسل کشی کے ۴۰۰ دن کیسے گزرے؟
- نوجوان مرد و خواتین میں بڑھتی تقسیم، وجہ کیا ہے؟
- سوپر چیٹ: یوٹیوبر نفرت پھیلا کر کما رہے ہیں
- بچوں کو موبائل کی لت سے کیسے بچایا جائے؟

قبضے کے خلاف بیس سالہ جنگ لڑنے کے بعد آج افغانستان میں حکمران ہیں۔ ان سے پہلے ایک جنگ ویت نام کی بھی تھی، جہاں پر وہی 'غیر متزلزل' امریکی نظریہ کارفرما تھا، جس کے تحت سپاہیوں کو کھلی اجازت تھی کہ 'ہر متحرک شے کو قتل کر دو'۔

اگر آپ ویت نام میں امریکی جنگ کے اہداف سے متعلق 'پینٹاگون پیپرز' اور دیگر دستاویزات کا مطالعہ کریں تو آپ کو نسل کشی سے متعلق کئی مباحث میں یہ 'غیر متزلزل' عزم نظر آئے گا۔ 'لوگوں کو سیدھا سیدھا قتل کر دیا جائے یا انہیں آہستہ آہستہ بھوک پیاس سے سسکا سسکا کر مارا جائے؟ دیکھنے میں زیادہ اچھا کیا لگے گا؟ پینٹاگون میں موجود مینڈرینوں کا مسئلہ یہ تھا کہ ان کے بقول امریکی جو 'زندگی، خوش حالی، دولت اور طاقت' کے خواہش مند ہیں، ان کے برعکس ایشیائی لوگ 'بڑے پُرسکون طریقے سے املاک کی تباہی اور جانی نقصان کو قبول کر لیتے ہیں'۔ جس کی وجہ سے امریکی مجبور ہو جاتے ہیں کہ 'اپنے اسٹرے ٹیجک اہداف کو منطقی انجام یعنی نسل کشی تک پہنچا سکیں'۔

کون اتنا بھاری وزن بغیر 'متزلزل' ہوئے اٹھا سکتا ہے؟

آج اتنے سال گزرنے کے بعد ہم دیکھ رہے ہیں کہ سال بھر سے ہمارے سامنے ایک اور نسل کشی جاری ہے۔ امریکا اور اسرائیل نسلی عصبیت کی بنیاد پر قائم نوآبادیاتی قبضے کو بچانے کے لیے غزہ اور لبنان میں اپنی 'غیر متزلزل' نسل کشی جاری رکھے ہوئے ہیں، جو ٹیلی ویژن پر براہِ راست دکھائی جا رہی ہے۔ اب تک سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۴۲ ہزار لوگ جاں بحق ہو چکے ہیں، جن میں سے اکثریت بچوں اور خواتین کی ہے۔ ان میں ابھی وہ شامل نہیں، جن کی چیخیں کسی عمارت، محلے، بلکہ پورے شہر کے ملبے تلے دبی رہ گئیں اور جن کی باقیات کو ابھی ملبہ کھود کر نکالنا اور لاشوں کی گنتی میں شمار کرنا باقی ہے۔ 'آکسفام' کی حالیہ تحقیق کے مطابق گزشتہ بیس برس کی کسی بھی جنگ کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ بچے غزہ میں مارے جا چکے ہیں۔

نازی جرمنی کے ہاتھوں یورپی یہودیوں کی نسل کشی کے وقت لاتعلق رہنے والے امریکا و یورپ نے اپنے جذبۂ جرم کی تسکین کے لیے ایک اور نسل کشی کا میدان سجا دیا ہے۔

تاریخ میں نسل کشی کی مرتکب ہونے والی ہر ریاست کی طرح اسرائیلی صہیونیوں نے بھی، جو خود کو اللہ کے چنیدہ لوگ سمجھتے ہیں، فلسطینیوں کے قتل عام اور ان کی زمینوں پر قبضے سے پہلے ان کو انسانی مرتبے سے گرانے کی کوشش کی:

☆ سابق اسرائیلی وزیر اعظم مناخم بیگن (م: ۱۹۹۲ء) نے فلسطینیوں کو 'دوٹانگوں والے درندے' قرار دیا۔

☆ جبکہ سابق اسرائیلی وزیر اعظم اسحٰق رابن (م: ۱۹۹۵ء) کے مطابق فلسطینی 'نڈیوں' کی مانند ہیں 'جنہیں کچلا جا سکتا ہے'۔

☆ گولڈا میئر (م: ۱۹۷۸ء) نے فلسطینیوں کے انسانی وجود کا ہی انکار کرتے ہوئے کہا: 'فلسطینی نام کی کوئی مخلوق وجود نہیں رکھتی'۔

☆ فسطائیت کے خلاف لڑنے کی شہرت رکھنے والے مشہور سور ما برطانوی وزیر اعظم ونسٹن چرچل (م: ۱۹۶۵ء) کا کہنا تھا کہ ''میں نہیں مان سکتا کہ کوئی کتا کھولی کا مالک بن سکتا ہے، چاہے جتنا عرصہ بھی وہ اس میں لیٹا رہے۔ کھولی کی حتمی ملکیت ایک 'اعلیٰ نسل' کے پاس ہی رہے گی''۔

چنانچہ ان 'دوٹانگوں والے درندوں'، 'نڈیوں'، 'کتوں' اور 'عدم موجود لوگوں' کو قتل کرنے، کونوں کھدروں میں دھکیلنے اور ان کی 'نسل کشی' کے بعد ایک نیا ملک قائم کیا گیا: اسرائیل۔ خوشی سے نعرے لگائے گئے کہ 'بے وطن قوم کو بے آباد وطن مل گیا'۔ امریکا و یورپ نے ایٹمی ہتھیاروں سے لیس اسرائیلی ریاست کو مشرق وسطیٰ کی دولت اور وسائل پر قبضے کے لیے اپنی چھاؤنی کے طور پر استعمال کیا۔ اسے کہتے ہیں 'مفادات کا حسین امتزاج'!

چنانچہ ہر جرم کے باوجود، اس نئی ریاست کی 'غیر متزلزل' اور 'بے جھجک' مدد کی گئی، اسے مسلح کیا گیا اور اس کی جیبیں بھری گئیں، اس کے ناز نخرے اٹھائے گئے اور سراہا گیا۔ یہ ریاست اس بگڑے ہوئے بچے کی طرح پروان چڑھائی گئی، جو امیر گھر میں پیدا ہوا اور والدین اس کے ہر ظلم و زیادتی پر فخر سے مسکراتے رہیں۔ چنانچہ آج اگر اسرائیلی، فلسطینیوں کی نسل کشی پر کھلے عام فخر کرتے دکھائی دیتے ہیں، تو حیرت کیسی؟ ('پینٹاگون پیپرز' کو کم از کم خفیہ رکھا گیا تھا۔ یاد رہے کہ انہیں چُرا کر شائع کیا گیا)۔ اگر اسرائیلی سپاہی تہذیب کے تمام تقاضے فراموش کر چکے ہیں تو کیسا تعجب؟

کیا یہ کوئی اَنہونی بات ہے کہ آج خواتین کو قتل یا بے گھر کرنے کے بعد ان کے زیریں جامے پہن کر گھٹیا وڈیوز سوشل میڈیا پر ڈالی جا رہی ہیں اور اسرائیلی فوجی، اپنے ہاتھوں مرتے ہوئے فلسطینیوں، زخمی بچوں اور آبروریزی و گھناؤنے تشدد کا شکار ہونے والے قیدیوں کی نقلیں اُتارتے دکھائی دیتے ہیں؟ آپ کو ایسی وڈیوز بھی مل جائیں گی کہ اسرائیلی فوجی سگریٹ کا دھواں اُڑاتے یا موسیقی کی دھنوں پر ناچتے ہوئے عمارتوں کو بارود سے اڑاتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں؟

اسرائیل کی ان حرکتوں کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟

اسرائیل اور اس کے اتحادیوں اور مغربی ذرائع ابلاغ کے مطابق: 'یہ جواب ہے ۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء کو حماس کے اسرائیل پر حملے، اسرائیلی شہریوں کا قتل اور اغوا کا'۔

اب یہ گفتگو کا وہ حصہ ہے جہاں مجھ سے توقع کی جائے گی کہ میں اپنی حفاظت کے پیش نظر، اپنی غیر جانب داری اور دانش ورانہ صلاحیتوں کو ثابت کرنے کے لیے فریقین کو برابر ثابت کروں۔ اپنی اخلاقی غیر جانب داری ثابت کرنے کے لیے اب مجھے حماس اور غزہ کی دیگر مسلح تنظیموں، لبنان اور حزب اللہ کی مذمت کرنی ہوگی کہ انہوں نے شہریوں کو قتل و اغوا کیا۔ پھر مجھے غزہ کے شہریوں کو بھی ڈانٹنا پڑے گا کہ وہ حماس کے حملے پر خوش کیوں ہوئے؟ یہ سب کرنے کے بعد ہر شے آسان ہو جاتی ہے۔ چھوڑیں جی دفعہ کریں، جب سب ایک جیسے ہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟

لیکن میں اس مذمتی کھیل کا حصہ نہیں بنوں گی۔ میرا نقطۂ نظر بڑا واضح ہے۔ مظلوم خود پر ہونے والے ظلم کے خلاف مزاحمت کیسے کرے اور اس کا اتحادی کون ہو، یہ فیصلہ کرنا میرا کام نہیں۔

امریکی صدر جو بائیڈن نے ۲۰۲۳ء میں دورۂ اسرائیل کے دوران اسرائیلی وزیر اعظم اور جنگی کابینہ سے ملاقات کرتے ہوئے کہا تھا: 'صہیونی ہونے کے لیے یہودی ہونا ضروری نہیں۔ میں بھی صہیونی ہوں'۔

صدر بائیڈن کے برخلاف جو خود کو 'غیر یہودی صہیونی' سمجھتے ہیں اور بالکل 'غیر متزلزل' طریقے سے جنگی جرائم کے لیے اسرائیل کو ہتھیار اور پیسہ فراہم کر رہے ہیں، اُنھیں دیکھتے ہوئے میں خود کو کسی ایسے خول میں محدود نہیں کروں گی، جس میں میرے لکھے ہوئے الفاظ نہ سما سکیں۔ میں وہی ہوں جو میں لکھتی ہوں اور وہی لکھتی ہوں، جو سوچتی اور دیکھتی ہوں۔

مجھے اس حقیقت کا پوری طرح احساس ہے کہ بطور ایک مصنف، بطور ایک غیر مسلم اور بطور ایک خاتون، میرا حماس، حزب اللہ یا ایرانی حکومت کے زیر اثر زندہ رہنا بہت مشکل یا شاید ناممکن ہو۔ لیکن فی الوقت یہ ہمارا موضوع ہی نہیں ہے۔ ہمیں اس تاریخ اور سیاق و سباق کو سمجھنا ہوگا، جس کے تحت یہ گروہ وجود میں آئے۔ فی الوقت اہم بات یہی ہے کہ یہ سب ایک نسل کشی کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں۔ ہمیں خود سے یہ پوچھنا چاہیے کہ آیا کوئی لبرل اور سیکولر فوج، نسل کشی کے اس بدمست ہاتھی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے؟ کیونکہ جب دنیا کی تمام طاقتیں ایک قوم کے خلاف ہوں تو وہ اپنے دفاع کے لیے خدا سے رجوع نہ کرے تو کیا کرے؟

مجھے معلوم ہے کہ ایرانی حکومت اور 'حزب اللہ' کے بہت سے ناقدین ان کے اپنے ملکوں میں بھی موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سے جیلوں میں اس سے بھی برے حالات کا سامنا کر رہے ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ حماس کے کچھ اقدامات

جنگی جرائم کے زمرے میں آتے ہیں، مثلاً ۷/اکتوبر کو عام شہریوں کا قتل واغوا لیکن پھر بھی اس کا موازنہ اس سب سے نہیں کیا جاسکتا، جو اسرائیل اور امریکا غزہ، مغربی کنارے اور اب لبنان میں کر رہے ہیں۔ فلسطینی زمینوں پر اسرائیلی قبضہ اور فلسطینیوں کی غلامی ۷/اکتوبر سمیت اس سارے فساد کی جڑ ہے۔ یاد رکھیے، اس مسئلے کا آغاز ۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء کو نہیں ہوا۔

میں یہاں اِس ہال میں موجود تمام سامعین سے یہ سوال پوچھتی ہوں کہ ہم میں سے کتنے اس ذلت آمیز زندگی کو قبول کرنے پر رضامند ہوں گے، جو فلسطینی کئی عشروں سے گزار رہے ہیں؟ کون سے پُرامن راستے ہیں، جو فلسطینیوں اور ان کی قیادتوں نے نہیں آزمائے؟ گھٹنوں کے بل گر کر مٹی چاٹنے کے علاوہ کون سا سمجھوتہ ہے، جو انہوں نے قبول نہیں کیا؟

آگاہ رہیے اور جان لیجیے کہ اسرائیل اپنے دفاع کی کوئی جنگ نہیں لڑ رہا ہے، بلکہ اسرائیل جارحیت مسلط کرنے کی لڑائی لڑ رہا ہے تاکہ مزید فلسطینی زمینوں پر قبضہ کر سکے، اپنی نسلی عصبیت کے نظام کو مزید مضبوط کر سکے، فلسطینی عوام اور خطے پر اپنی گرفت مضبوط تر کر سکے۔ ۷/اکتوبر سے جاری جنگ میں ہزاروں لوگوں کو جان سے مار دینے کے ساتھ ساتھ اسرائیل، غزہ کی اکثریتی آبادی کو کئی دفعہ دربدر کر چکا ہے۔ اس نے ان کے اسپتالوں پر حملے کیے ہیں۔ ڈاکٹروں، امدادی کارکنوں اور صحافیوں کو جان بوجھ کر نشانہ بناتے ہوئے قتل کیا ہے۔ ایک پوری قوم کو بھوکوں مارا جا رہا ہے کہ ان کی تاریخ ہی مٹ جائے۔ دنیا کی امیر ترین اور طاقت ور ترین حکومتیں اور ان کے ذرائع ابلاغ اخلاقی و مادی سطح پر پوری طرح ان سارے مظالم میں شامل ہیں۔ ان میں میرا وطن بھارت بھی شامل ہے، جو اسرائیل کو ہتھیار اور ہزاروں کارکن فراہم کرتا ہے۔

یہ سب ممالک اسرائیل کے ساتھ یک جان دو قالب ہو چکے ہیں۔ گزشتہ صرف ایک سال میں امریکا اسرائیل کو ۱۷/ارب ڈالر کی فوجی امداد بھیج چکا ہے۔ چنانچہ اب مناسب ہے کہ امریکی اس جھوٹ کا لبادہ اتار دیں کہ وہ 'ثالث ہیں'، 'جنگ کے مخالف ہیں'، یا جیسا کہ انتہائی بائیں بازو کا حصہ سمجھی جانے والی الیکسینڈریا اوکاسیو کورٹیز کا کہنا ہے کہ 'ہم جنگ بندی کے لیے سرتوڑ کوششیں کر رہے ہیں'۔ مَیں برملا کہوں گی کہ جو فریق بذاتِ خود نسل کشی میں شامل ہو، وہ ہرگز ثالث نہیں ہوسکتا۔

دنیا کی ساری طاقت، سارا پیسہ، سارے ہتھیار اور سارا پروپیگنڈا مل کر بھی اس زخم کو چھپا نہیں سکتے، جسے ہم فلسطین کہتے ہیں۔ اس زخم سے تمام انسانیت کا خون رِس رہا ہے۔

سلامتی کونسل میں رائے شماری کے مطابق جو ممالک اسرائیلی نسل کشی کو ممکن بنا رہے ہیں، ان کی اکثریتی آبادی اس کے خلاف ہے۔ ہم نے ان ممالک میں مسلسل لاکھوں احتجاج کرنے والوں کے مظاہرے دیکھے ہیں۔ ان میں نوجوان یہودیوں کی وہ اکثریت بھی شامل ہوتی ہے، جو اسرائیل کی سرپرستی کے لیے گھڑا جانے والا جھوٹ سن سن کر اور کسی کے ہاتھوں استعمال ہو ہو کر تنگ آ چکی ہے۔ کیا کبھی کسی نے سوچا تھا کہ ایک دن جرمن پولیس، یہودیوں پر ہی 'یہود دشمنی' کا الزام لگا کر انہیں صہیونیت اور اسرائیل کے خلاف مظاہرے میں گرفتار کرے گی؟ کس نے سوچا تھا کہ امریکی حکومت، اسرائیل کی خدمت میں یہاں تک چلی جائے گی کہ اسے آزادئ اظہار کے اپنے بنیادی اصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فلسطین پسند نعروں پر پابندی لگانا پڑے؟ کچھ استثنائی صورتوں کے علاوہ ساری مغربی دنیا کے اخلاقی اصول آج باقی دنیا کے لیے ایک خوفناک لطیفہ بن چکے ہیں۔

اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو نے جب دنیا کے سامنے 'دریا سے سمندر تک اسرائیل' کا وہ نقشہ لہرایا، جس میں فلسطین سرے سے موجود ہی نہیں، تو دنیا ان کے آگے بچھی دیکھی گئی ہے کہ کیسا بابصیرت آدمی ہے جو یہودیوں کے قومی وطن کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ دوسری طرف جب فلسطینی یا ان کے اتحادی 'نہر سے بحر تک' کا نعرہ لگاتے ہیں تو انہیں الزام دیا جاتا ہے کہ وہ کھلے عام یہودیوں کی نسل کشی کا اعلان کر رہے ہیں۔

کیا واقعی ایسا ہے؟ یا انہیں اپنا خبث باطن دوسروں میں دکھائی دے رہا ہے؟ یہ کیسی ذہنیت ہے، جو تنوع برداشت نہیں کر سکتی؟ جو ایک ملک میں دوسروں کے ساتھ برابری کی سطح پر مساوی حقوق کیساتھ رہنے کے لیے تیار نہیں؟ کیا ساری دنیا اسی طرح رہتی ہے؟ یہ وہ ذہنیت ہے جو قبول نہیں کر سکتی کہ فلسطینی بھی جنوبی افریقا، بھارت اور نوآبادیاتی چنگل سے آزاد ہونے والے دوسرے ممالک کی طرح آزاد زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ ایسے ممالک کی طرح جو متنوع آبادی کے حامل ہیں، چاہے کئی بنیادی مسائل سے دوچار ہوں، لیکن آزاد ہیں۔ جب جنوبی افریقا کے باشندے اپنا مشہور نعرہ 'عوام زندہ باد' لگایا کرتے تھے تو کیا وہ گورے لوگوں کی نسل کشی کا اعلان کر رہے تھے؟ ہرگز نہیں۔ وہ نسلی عصبیت پر مبنی حکومتی نظام کا خاتمہ چاہتے تھے اور آج یہی مطالبہ فلسطینیوں کا ہے۔

جو جنگ اب شروع ہوئی ہے، یہ بہت تکلیف دہ ہوگی۔ لیکن اس کا خاتمہ اسرائیل میں نسلی عصبیت کے خاتمے کے ساتھ ہوگا۔ یہودیوں سمیت سب کے لیے، پوری دنیا پہلے سے زیادہ محفوظ ہوگی اور دنیا میں انصاف ہوگا۔ ہمارے دلوں سے آخرکار یہ کانٹا نکل جائے گا۔

اگر امریکی حکومت، اسرائیلی حمایت سے دست بردار ہو جائے تو آج ہی یہ جنگ ختم ہو جائے گی۔ ابھی اسی لمحے سب قتل و غارت گری بند ہو جائے گی۔ اسرائیلی مغوی اور فلسطینی قیدی آزاد ہوں گے۔ حماس اور دیگر فلسطینی نمائندوں کے ساتھ جو مذاکرات جنگ کے بعد ہونے ہیں، وہ ابھی ہو سکتے ہیں اور یوں لاکھوں لوگوں کو تکلیف اور تباہی سے بچایا جاسکتا ہے۔ کیسی دردناک بات ہے کہ کچھ لوگوں کے لیے یہ امکان ہی ناقابلِ تصور ہے کہ انہیں اس پر ہنسی آئے گی!

علاء عبدالفتح! اختتام پر میں پھر تمھاری طرف آؤں گی۔ میں تمھاری کتاب تم ابھی ہارے نہیں (Not Yet Been Defeated) کا ذکر کروں گی، جو تم نے جیل میں لکھی ہے۔ ہار اور جیت کے معنی سے متعلق ایسے خوب صورت الفاظ میں نے اور کہیں نہیں پڑھے، نہ میں نے کسی اور کو یوں مایوسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھا ہے۔ میں نے کم ہی ایسا کام دیکھا ہے جس میں ایک شہری اپنی ریاست، اپنے جرنیلوں، اور (قاہرہ کے التحریر) چوک کے ان نعروں سے اس قدر واضح انداز میں الگ کھڑا نظر آتا ہے:

مرکز میں کھڑے ہونا بغاوت ہے کیونکہ مرکز کی جگہ صرف جرنیل کے لیے ہے۔

مرکز بغاوت کی جگہ ہے اور میں کبھی باغی نہیں رہا۔

وہ ہمیں کناروں کی طرف دھکیل کر خوش ہیں، لیکن وہ نہیں جانتے کہ ہم مرکز سے ہٹے نہیں، بس کچھ دیر کے لیے کھو گئے تھے۔

ووٹوں کے ڈبے، محل سرا، وزارتیں، قیدخانے یہاں تک کہ قبریں بھی اتنی کشادہ نہیں ہیں کہ ان میں ہمارے خواب سما سکیں۔

ہم نے کبھی مرکز میں ہونا نہیں چاہا کیونکہ یہ اپنے خوابوں سے منہ موڑنے والوں کی جگہ ہے۔ یہاں تک کہ وہ چوک بھی ہمارے لیے کافی نہیں تھا۔ اس لیے ہم نے انقلاب کی جنگ اس سے ہٹ کر لڑی اور ہمارے اکثر ہیرو منظر سے باہر رہے۔

غزہ اور لبنان کی جنگ ایک علاقائی جنگ میں تبدیل ہونے کو ہے اور اس کے ہیرو بھی منظر سے باہر ہیں۔ لیکن وہ لڑ رہے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایک دن 'دریا سے سمندر تک، فلسطین آزاد ہوگا' (From the River to the Sea - Palestine will be Free) اور یہ ہو کر رہے گا۔

اپنی نظریں گھڑیوں پر نہیں، کیلنڈر پر رکھیں۔ کیونکہ اپنی آزادی کے لیے لڑنے والے عوام، یہاں پر میں جرنیلوں کی بات نہیں کر رہی، بلکہ عوام کی کر رہی ہوں اور عوام اسی طرح اپنے وقت کا فیصلہ کرتے ہیں۔

(بحوالہ: ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' لاہور۔ نومبر ۲۰۲۴ء)

اسرائیل پر عالمی ایف آئی آر

Julian Borger

اقوامِ متحدہ کی ایک خصوصی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ غزہ میں اسرائیل کی عسکری کارروائیوں کو محتاط ترین الفاظ میں بھی صرف قتلِ عام کہا جاسکتا ہے۔ کمیٹی کا کہنا ہے کہ اسرائیل نے ایک طرف غزہ میں قتلِ عام جاری رکھا ہے اور دوسری طرف مقبوضہ غربِ اردن میں نسلی امتیاز کی پالیسی پر عمل کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں فلسطینیوں کے مسائل میں اضافہ ہی ہوا ہے۔

اقوامِ متحدہ کی خصوصی تحقیقاتی کمیٹی کا کہنا ہے کہ جو کچھ بھی اسرائیل نے فلسطینیوں کے ساتھ کیا ہے، وہ ہر اعتبار سے قتلِ عام قرار دیے جانے کے قابل ہے۔

یہ کمیٹی اسرائیلی قبضے کے بارے میں تحقیقات کے لیے ۱۹۶۸ء میں قائم کی گئی تھی۔ اپنی سالانہ رپورٹ میں کمیٹی نے کہا ہے کہ اسرائیل منظم طریقے سے خوراک کی قلت اور فاقہ کشی کو ایک اہم جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا آیا ہے۔ غزہ میں ۱۳ ماہ کے دوران اسرائیل نے فلسطینیوں کو خوراک سے محروم رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اسرائیل مقبوضہ بیت المقدس سمیت پورے مقبوضہ غربِ اردن میں نسلی امتیاز کی پالیسی اپناتے ہوئے وہاں یہودیوں کو بسانے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ فلسطینیوں کو اُن کی زمینوں سے بے دخل کیا جارہا ہے۔

عالمی عدالتِ انصاف (ICJ) بھی اسرائیل کے خلاف قتلِ عام کے الزامات کے تحت تحقیقات کر رہی ہے۔ یہ مقدمہ جنوبی افریقا نے دائر کیا ہے۔ مقدمے کے مطابق اسرائیلی فوج غزہ میں قتلِ عام کر رہی ہے۔ بچوں اور خواتین کو خاص طور پر نشانہ بنایا جارہا ہے۔ عالمی عدالتِ انصاف نے اسرائیلی حکومت کو حکم دیا ہے کہ وہ ایسے اقدامات کرے جن سے قتلِ عام کی روک تھام ہو۔

۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد قائم کی جانے والی اقوامِ متحدہ کی خصوصی کمیٹی کو فلسطینی عوام اور دیگر مقبوضہ عرب علاقوں میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے معاملات کی چھان بین کا مینڈیٹ دیا گیا تھا۔ یہ کمیٹی اقوامِ متحدہ کے ارکان ملائیشیا، سینیگال اور سری لنکا کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔

اسرائیل نے اقوامِ متحدہ کی خصوصی کمیٹی کی رپورٹ کے حوالے سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا ہے۔ اسرائیلی حکومت قتلِ عام کے الزامات کی ڈھٹائی سے تردید کرتے ہوئے قتلِ عام کرتی آئی ہے۔ اقوامِ متحدہ میں اسرائیلی مشن نے ماہِ رواں کے دوران اقوامِ متحدہ کو بتادیا تھا کہ وہ غزہ اور دیگر فلسطینی علاقوں میں خوراک اور دیگر امداد کی تقسیم پر مامور ادارے UNRWA سے تین ماہ کے اندر اشتراکِ عمل ترک کر رہی ہے۔

خصوصی کمیٹی نے رپورٹ میں بتایا ہے کہ اس نے غزہ، غربِ اردن اور گولان کی پہاڑیوں کے علاقوں کا دورہ کرنے کی اجازت طلب کی تھی مگر اسرائیل کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ معاملات کا خود جائزہ لینے کے لیے کمیٹی کے ارکان اور عملے کے افراد ان علاقوں میں نہ جاسکے۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ مختلف ذرائع سے موصول ہونے والی رپورٹس اور تجزیوں کا جائزہ لینے کے بعد مرتب کی ہے۔ کمیٹی کا کہنا ہے کہ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں انسانی حقوق اور بین الاقوامی تسلیم شدہ حقوق کی سنگین خلاف ورزیاں کی جارہی ہیں۔ سب سے زیادہ خطرناک اور شرمناک بات یہ ہے کہ خوراک کی قلت کو جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ اس کے نتیجے میں لوگوں کی صحت کا معیار گر رہا ہے اور اموات واقع ہورہی ہیں۔ ایک سال سے بھی زائد مدت کے دوران اسرائیل نے غزہ میں جو کچھ روا رکھا ہے، اُس کا جائزہ لینے اور تجزیہ کرنے کی صورت میں یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ اسرائیل صریحاً قتلِ عام کی راہ پر گامزن ہے۔

کمیٹی کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ غزہ میں غیر متحارب شہریوں کو بھی انتہائی بے دردی سے قتل کیا گیا ہے۔ ہلاکتوں میں زیادہ تعداد خواتین اور بچوں کی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صورتِ حال کس قدر سنگین ہے۔ غزہ میں صحت و بہبودِ عامہ کا نظام تباہ ہوچکا ہے۔ بیماروں کا علاج نہیں ہو پارہا۔ حاملہ خواتین کی نگہداشت ممکن نہیں ہو پارہی۔ حمل کے ضائع ہو جانے یا پیٹ ہی میں بچوں کے مرجانے کے واقعات میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے۔ نوزائیدہ بچے انتہائی کمزور ہیں۔ جن ماؤں کو کھانا ٹھیک سے نہ ملا ہو وہ انتہائی کمزور بچوں کو جنم دے رہی ہیں۔ اس کے نتیجے میں ہلاکتوں کا دائرہ مزید وسیع ہورہا ہے۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ گزشتہ برس ۷ اکتوبر کے بعد سے اب تک اسرائیلی حکومت نے دانستہ بھرپور کوشش کی ہے کہ فلسطینیوں تک بیرونی ذرائع سے خوراک نہ پہنچ پائے۔ انہیں پانی اور ایندھن سے بھی محروم رکھا جاتا رہا ہے۔ فلسطینیوں کی انتہائی بنیادی ضرورتوں کو بھی سیاست اور فوجی حکمتِ عملی کی نذر کردیا گیا ہے۔

جنوری میں عالمی عدالتِ انصاف نے جنوبی افریقا کے دائر کیے ہوئے مقدمے کی روشنی میں اسرائیل کی حکومت کو حکم دیا کہ وہ ایسے تمام اقدامات ترک کردے جو قتلِ عام کے زمرے میں آتے ہیں یا اس کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ عالمی عدالتِ انصاف نے اسرائیل کو یہ حکم بھی دیا کہ وہ غزہ کے فلسطینیوں تک خوراک، ایندھن، پانی اور دواؤں سمیت بنیادی ضرورت کی تمام اشیا پہنچنے دے۔ اسرائیلی حکومت کو یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ وہ ایسے تمام اقدامات کا ریکارڈ رکھے جو قتلِ عام کے زمرے میں آتے ہیں۔

یہ کوئی پہلا موقع نہیں ہے کہ عالمی برادری نے اسرائیل کو اُس کے مظالم کے حوالے سے آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سے غزہ میں جنگ کے نام پر اسرائیلی فوج نے انسانیت سوز مظالم ڈھانے کا سلسلہ شروع کیا ہے تب سے اب تک یورپ کے کئی اداروں اور شخصیات نے اس طرف عالمی برادری کی توجہ دلانے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ اسرائیل جان بوجھ کر شہریوں اور بالخصوص خواتین اور بچوں کو نشانہ بنا رہا ہے۔ مردوں کی شہادت سے خواتین بیوہ اور بچے یتیم ہورہے ہیں جبکہ خواتین کے شہید ہوجانے سے یتیم بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا بھی کوئی نہیں رہتا۔ یہ انتہائی نوعیت کی کیفیت ہے جو جنگی جرائم کے کھاتے میں ڈالی جانی چاہیے۔

اسرائیلی فوج نے غزہ میں بہت بڑے پیمانے پر شہری آبادیوں کو نشانہ بنا کر ہزاروں عمارتوں کو ملیامیٹ کردیا ہے۔ جب بھی فوجی کارروائی روکی جائے گی تب تعمیرِ نو کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ فلسطینیوں کی بحالی اور دوبارہ آبادکاری آسان نہیں ہوگی۔ اس کے لیے بیسیوں ارب ڈالر درکار ہوں گے۔

اقوامِ متحدہ کی خصوصی کمیٹی کی رپورٹ عالمی برادری کی خصوصی توجہ چاہتی ہے۔ فلسطینیوں نے بہت کچھ جھیلا ہے۔ اب اُن کے وجود ہی کو خطرہ لاحق ہے۔ یہی خطرہ لبنان کو بھی لاحق ہے اور لبنانی وزیرِ اعظم نجیب میکاتی بارہا کہہ چکے ہیں کہ اسرائیل کو انسانیت سوز مظالم ڈھانے سے روکنا عالمی برادری کی ذمہ داری ہے اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو لبنان کے وجود کو خطرہ لاحق ہوجائے گا۔

اسرائیل کے خلاف امریکا اور دیگر بڑی قوتوں نے

////// باقی صفحہ نمبر ۸ \\\\\\

یورپ کس طرف جا رہا ہے؟

Denis MacShane

(یورپ اور امریکا کا ساتھ ناگزیر سا رہا ہے مگر اب یہ ناگزیریت ختم ہوتی جارہی ہے۔ یورپ نے ایک زمانے تلک امریکا کو اپنے دفاع کے لیے مؤثر طور پر استعمال کیا ہے، مگر اب امریکی پالیسیوں میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں لائی جارہی ہیں۔ یہ تبدیلیاں یورپی اقوام کے لیے پریشان کن ہیں کیونکہ امریکی قیادت یورپ کو اپنے لیے ناگزیر سمجھنے کی پوزیشن سے ہٹتی جارہی ہے۔
یورپ کے لیے بھی یہ فیصلے کی گھڑی ہے۔ یورپی قائدین پہلے ہی اچھا خاصا وقت لے چکے ہیں۔ اُن کے پاس اب زیادہ وقت نہیں۔ یورپ کے مجموعی مقدر کے لیے بہت جلد کوئی ایسا فیصلہ ناگزیر ہے جس کا تعلق تمام یورپی اقوام سے ہو۔ یوکرین جنگ نے فیصلے کی گھڑی کو بہت نزدیک لا کھڑا کیا ہے۔)

امریکا میں ڈونلڈ ٹرمپ دوسری بار صدر کا انتخاب جیت گئے ہیں۔ اب اہم سوال یہ ہے کہ یورپ کس طرف جارہا ہے۔ تجزیہ کاروں کی نظر میں ڈونلڈ ٹرمپ کی فتح یورپ کے لیے ویک اَپ کال ہے۔ اُسے اب اپنے لیے کوئی جامع حکمتِ عملی تیار کرنا ہوگی، کوئی واضح راستہ منتخب کرنا ہوگا اور اُس پر چلنا بھی ہوگا۔

امریکی صدارتی انتخابات صرف امریکا کے لیے نہیں بلکہ یورپ سمیت باقی دنیا کے لیے بھی بہت اہم تھے۔ ایک دنیا امریکی صدارتی انتخاب کے نتائج دیکھنے کے لیے بے تاب تھی۔ سبھی یہ دیکھنے کے متمنی تھے کہ ڈونلڈ ٹرمپ کی دوبارہ آمد کی صورت میں امریکا پوری دنیا کو کس طرف لے جائے گا۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں اب کسی کو عار محسوس نہیں ہونی چاہیے کہ ڈونلڈ ٹرمپ کی دوبارہ آمد امریکا کے لیے انتہائی بنیادی نوعیت کی تبدیلیوں کی راہ ہموار کرے گی۔ امریکا اب عوامی طاقت کے بل پر چلے گا، قوم پرست ریاست میں تبدیل ہوگا اور معاشرے کو تقسیم کرنے والی سیاست کا حامل ہوگا۔

ڈونلڈ ٹرمپ قانونی و غیر قانونی، دونوں ہی طرح کے تارکینِ وطن کو پسند نہیں کرتے۔ انہوں نے سب سے پہلے امریکا کا نعرہ لگا کر پوری قوم میں تارکینِ وطن کے حوالے سے کچھ نیا ہی جذبہ پھونک دیا ہے۔ خیر، جذبے پر نفرت سبقت لے گئی ہے۔

یورپ میں ٹرمپ کی سی سوچ رکھنے والے سیاست دانوں کی کمی نہیں۔ میرین لی پین، جیورجیا میلونی، گیئرٹ ولڈرز، نائجل فیریج، رابرٹ فیکو، وکٹر اوربان، جیروسلو کیزنسکی وغیرہ وغیرہ۔

انگلینڈ کی کنزرویٹو پارٹی کی نئی لیڈر کیمی بیڈینوک کے والدین کا تعلق نائیجیریا سے ہے تاہم وہ بھی تارکینِ وطن کے خلاف سوچنے اور بولنے میں یورپ کے انتہائی دائیں بازو کے سیاست دانوں کی ہم نوا معلوم ہوتی ہیں۔

یورپ میں تارکینِ وطن کے خلاف نفرت بڑھتی جارہی ہے۔ ہنگری کے لیڈر وکٹر اوربان، سلووینیا کے لیڈر رابرٹو فیکو اور سربیا کے لیڈر الیگزینڈر ووسِک تارکینِ وطن کے خلاف بولنے اور برتنے کے معاملے میں بہت آگے ہیں۔

کُھل کر اور ڈھکے چھپے طریقے سے یہ تمام سیاسی قائدین چاہتے ہیں کہ یوکرین اب روس کے آگے گھٹنے ٹیک دے اور سابق سوویت یونین کی زمینوں میں روس کی نیم نوآبادیاتی قوت کے طور پر واپسی کو قبول کرے۔

ڈونلڈ ٹرمپ یورپی اقدار کے بارے میں توہین آمیز ریمارکس دیتے رہے ہیں اور اُنہوں نے یہ کہنا نہیں چھوڑا جرمن اُنہیں پسند نہیں کرتے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یورپ کی سیاست اور حکمرانی کے اطوار پر تنقید کرتے رہے ہیں۔ یورپ اندرونی طور پر خاصا کمزور ہے۔

ڈونلڈ ٹرمپ نے یہ کہتے ہوئے خاصی ہلچل مچائی ہے کہ یورپ کے دفاع کی ذمہ داری امریکا کے کاندھوں پر آپڑی ہے جس کے نتیجے میں یورپی یونین کے ارکان اور برطانیہ بے فکر ہوگئے ہیں اور اپنی دفاعی صلاحیت بڑھانے پر خاطر خواہ توجہ دے رہے ہیں نہ فنڈنگ کر رہے ہیں۔ افواج کی نفری بھی نہیں بڑھائی جارہی ہے اور اسلحے کی خریداری اور تیاری بھی خاطر خواہ نہیں۔ افواج کو جدید خطوط کے مطابق تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر ایسا کچھ نہیں کیا جارہا۔ ٹیکنالوجی نے لازم کردیا ہے کہ ہر فوج اپنے آپ کو تبدیل کرے۔

یورپ میں اس وقت ۱۲ اقسم کے ٹینک تیار کیے جارہے ہیں۔ یورپی قائدین اشتراکِ عمل کے ذریعے مشترکہ دفاعی صلاحیت پروان چڑھانے کے بجائے قدیم، سال خوردہ ماڈل کے مطابق اپنی اپنی سرحدوں کے دفاع تک خود کو محدود رکھنے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ ہاڈرویئر کی سطح پر بھی افواج کے درمیان اشتراکِ عمل کو ترجیح نہیں دی جارہی۔ مشترکہ مشقوں اور دفاع کے معاملے میں عملی سطح پر ایک دوسرے کا ساتھ دینے کا تصور مفقود ہوتا جارہا ہے۔

بہت سوں کے نزدیک یہ بات بھی انتہائی حیرت انگیز ہے کہ ایئر بس نے یوکے کامیٹ یا فرینچ کارواویل کی جگہ یورپ کی طرف سے ایک ورلڈ کلاس ایئر لائنر تیار کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس وقت ایئر بس نے ٹیک آف کیا تب جرمنی، اٹلی اور اسپین میں ایئر لائنر یعنی طیارے بنانے کی انڈسٹری تھی ہی نہیں، اس لیے انہیں مسابقت سے بچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ ہر یورپی قوم اپنے طور پر بحری جنگی جہاز، ڈرون، میزائل، آرمرڈ گاڑیاں اور دیگر ساز و سامان تیار کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ چند ایک چیزیں ہی مل کر بنائی جارہی ہیں۔ مثلاً فرانس اور برطانیہ مل کر درمیانے فاصلے تک مار کرنے والے میزائل اسٹارم شیڈو تیار کر رہے ہیں۔ فرانس میں اس میزائل کو Scalp کہا جاتا ہے۔ یورپی اقوام سے اسلحے اور گولا بارود کی کاٹیج انڈسٹریز چلائی جارہی ہیں۔ انہیں بڑے پیمانے پر جدید ترین ہتھیار خریدنے کے لیے امریکا کی طرف دیکھنا پڑ رہا ہے۔

ڈونلڈ ٹرمپ کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ خاصے حقیقت پسند ہیں اور اسی لیے اُن کی باتیں بہت عجیب لگتی ہیں۔ وہ امریکی مفادات کو باقی تمام معاملات پر مقدم رکھنے کی سوچ پر عمل پیرا رہنے کی ترجیح دیتے ہیں۔

یورپی اقوام اچھی طرح جانتی ہیں کہ امریکا نہ ہو تو اُن کے لیے اپنا مؤثر دفاع ممکن نہ رہے۔ یہی سبب ہے کہ بعض معاملات میں یورپی اقوام امریکا کی نیت کا فتور جانتے ہوئے بھی اُس کے ہاتھوں میں کھلونا بنی رہتی ہیں۔ اس وقت بھی ایسا لگ رہا ہے کہ ٹرمپ یورپ سے کھیل رہے ہیں۔

یورپ میں قومی ریاستوں کا معاملہ ہمیشہ اولین ترجیح اور مضبوط ترین ٹرینڈ کا رہا ہے۔ امریکا نے قوم پرستی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کمزوریوں کے انتہائی خطرناک اور ہلاکت خیز نتائج سے یورپ کو دو بار بچایا ہے اور اپنے فوجیوں کی جانیں قربان کی ہیں۔ دو عالمگیر جنگوں میں یورپ اس قابل نہیں تھا کہ اپنے وجود کو تن تنہا یعنی محض اپنی صلاحیت و سکت سے برقرار رکھ پاتا۔ یورپ کی بقا یقینی بنانے میں امریکا کے کلیدی کردار ہی کی بدولت برطانوی اور فرانسیسی سلطنت کے مفادات کو تحفظ حاصل ہوسکا۔

وہ دور اب جاچکا ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ سب سے پہلے امریکا کا نعرہ پہلے بھی لگا چکے ہیں اور اب بھی لگا رہے ہیں۔ یورپی اقوام کے درمیان اختلاف اور انتشار انتہائی حدود کو چُھو رہا ہے۔ قومی مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کے نام پر پورے

////// باقی صفحہ نمبر ۱۵ \\\\\\

ٹرمپ کی علاقائی تبدیلیاں

عبدالرحمٰن الراشد

نومنتخب امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کو سمجھنے اور ان کے بارے میں رائے قائم کرنے میں ایک بڑی غلطی کا شکار عام طور پر بہت سے لوگ ہو جاتے ہیں۔ یہ کجی ماضی میں اس وقت بھی درپیش رہی جب ڈونلڈ ٹرمپ پہلی بار امریکی صدر منتخب ہوئے اور چار سال وائٹ ہاؤس میں گزارنے کے بعد سے لے کر دوسری بار صدر بننے کی تگ و دو سے لے کر اب نومبر ۲۰۲۴ء میں صدر منتخب ہو جانے تک ان کے بارے میں رائے قائم کرنے میں غلطی کی جارہی ہے۔ غلطی یہ کی جارہی ہے 'صدر ٹرمپ اپنے پیش رو صدور کے مقابلے میں کم صلاحیت کے مالک ہیں'۔

یہ عمل درحقیقت ڈونلڈ ٹرمپ کی صلاحیت کو کم ثابت کرنے کی کوشش ہے۔ یہ تسلیم کہ ڈونلڈ ٹرمپ کا اندازِ بیان اور زبان علمی چاشنی سے الگ ہے، ان کا طرز گفتگو اور گفتگو کا لفظی لبادہ تجزیہ کاروں کی طرح نہیں ہوتا۔ وہ پرانے اور تجربہ کار سیاست دانوں کی طرح زبان کے ذریعے شائستگی کے دھیمے اور میٹھے پن کے ساتھ چالبازی بھی نہیں کرتے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

میری دانست میں یہ حکم لگانا کہ وہ آگاہی کے معاملے میں کمزور ہیں، کسی بھی طرح درست نہیں ہے۔ تاہم اس وجہ سے ان کے مخالفین مضحکہ اڑاتے رہے ہیں۔ ان کی انتخابی مہم کے دوران متعصبانہ جھڑپوں کا ہونا بھی مخالفین کی اپنی رائے کے حق میں دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض لوگ ڈونلڈ ٹرمپ کی غیر معمولی جیت کے بعد بھی یہی غلطی کر رہے ہیں اور ان کی صلاحیتوں کو کمتر ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بلاشبہ ٹرمپ سابق صدر بل کلنٹن کی طرح ییل یونیورسٹی کے فارغ التحصیل نہیں ہیں۔ نہ ہی جوبائیڈن کی طرح کانگریس اور سیاست کی دنیا میں ۵۰ سال کا تجربہ ہے۔ لیکن یہ بات بھی بھولنے کی نہیں ہے کہ انہوں نے صدارت کے چار برسوں میں سامنے آنے والے مسائل سے نمٹنے کے دوران جو کچھ تجربہ اور شناخت حاصل کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ ٹرمپ کی ان چار برسوں کی کامیابیاں سب چیزوں پر حاوی ہیں۔

جب صدر ٹرمپ نے ایران کے ساتھ 'جوائنٹ کمپری ہینسو پلان آف ایکشن' کو منسوخ کرنے کی دھمکی دی تو کہہ دیا گیا کہ یہ ایک بین الاقوامی معاہدہ ہے اس سے دستبرداری اختیار نہیں کر سکتے۔ لیکن ٹرمپ نے اس معاہدے کو مکمل طور پر ختم کر کے خطے کی تاریخ کا دھارا ہی بدل دیا۔ خطے کو کوئی اس ناقص معاہدے سے ٹرمپ کے بغیر نہیں بدل سکتا تھا۔

یہ بھی کہہ لیں کہ ٹرمپ ہنری کسنجر کی طرح دانشور اور جمی کارٹر کی طرح شائستہ نہیں قرار دیے جا سکتے۔ لیکن کاروبار، سرمایہ کاری اور رئیل اسٹیٹ کا غیر معمولی پس منظر کے حامل ہونے کی وجہ سے امریکا جیسے سرمایہ دار ملک کے لیے انتہائی مفید ہو سکتے ہیں۔ اپنی محنت، مسابقت اور مؤقف کے تسلسل پر ٹرمپ کے بیانات ان کے اپنے خیالات اور مؤقف کا اظہار ہیں۔ مگر ٹرمپ نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا لوہا بھی منوالیا ہے۔ انہوں نے اپنی صلاحیت منواتے ہوئے دوبارہ صدارتی انتخاب جیت لیا ہے۔ ان کی مقبولیت بھی حیران کن رہی ہے۔ ان کی بنیاد پر وہ بہت سے ایسے فیصلے کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے جس کی کوئی اور ہمت ہی نہیں کر سکتا۔

ٹرمپ بطور منتخب صدر امریکا کے اندر بھی متعدد، مسائل اور جھگڑوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہیں، جیسا کہ انہوں نے اپنے حامیوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ امیگریشن، معیشت اور تعلیم کے شعبوں میں تبدیلیاں لائیں گے، جو ممکنہ طور پر ان کی اگلی چار سالہ مدت کے دوران بہت سے تنازعات کا باعث بنیں گے۔

مشرق وسطیٰ میں کیا ہوگا؟

اس سوال پر غور کرنے کے لیے ہمیں ان کی پہلی مدت صدارت کو یاد کرنا ہوگا کہ ٹرمپ نے ۲۰۱۷ء میں اپنی مدت کے آغاز میں کیسے کیا تھا۔ انہوں نے پروٹوکول کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا۔ روایتی طور پر برطانیہ نے امریکی صدر کے لیے پہلی بیرون ملک سے کال کی۔ ٹرمپ نے بطور صدر اپنے پہلے دورے کے لیے انتخاب سعودی عرب کا کیا تھا۔ امریکی سیاست دانوں نے اس صورت حال میں سعودی عرب کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ ٹرمپ سے قبل ان کے پیش رو صدر براک اوباما نے مملکت کے ساتھ تعلقات کو امریکی سفارت کاری کے ماضی کی طرف منتقل کر دیا تھا۔

کہا جا سکتا ہے کہ ٹرمپ نے عربوں اور مسلمانوں کے خلاف نسل پرستی کے الزامات کے درمیان انتخابی میدان میں اترنے کے باوجود ایک جرأت مندانہ اقدام کیا جس نے سعودی عرب کو اپنے پہلے دورے کے لیے چنا۔ اس اقدام نے سب کو حیران کر دیا تھا۔ اس دورے نے واشنگٹن میں مخالف سیاست دانوں اور خطے کے ممالک کو ایک پیغام بھیجا ہے۔ اگلے چار سالوں میں، امریکا سعودی تعلقات ٹرمپ کے ارادے کے مطابق آگے بڑھے۔ جوبائیڈن نے ان کی جگہ لی تو بالآخر ٹرمپ کے راستے پر چل دیا۔

اس لیے میں کہوں گا اس معاملے کو جانچنے کی کوشش کی جائے کہ ٹرمپ دنیا کو کس طرح دیکھ رہے ہیں بلکہ 'فوکس' اس پر کیا جانا چاہیے دنیا ٹرمپ کو کس طرح دیکھ رہی ہے۔ آیا سمجھ بھی پا رہی ہے یا نہیں۔

اب جبکہ نومنتخب صدر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ یوکرین جیسے سنگین بحرانوں اور غزہ اور لبنان کی جنگوں کو ختم کر سکتے ہیں تو ان پر یقین کیا جانا چاہیے۔ کانگریس کے دونوں ایوانوں میں اکثریت کے ساتھ ٹرمپ کافی فیصلہ کن حیثیت کے ساتھ آگے آرہے ہیں۔ انہوں نے ۲۰ جنوری کو باضابطہ طور پر اپنا عہدہ سنبھالنے سے پہلے ہی بہت سے رابطے کرنا شروع کر دیے ہیں۔ وہ کام کرنے میں تیز ہیں اور اپنے الفاظ کے پابند نظر آتے ہیں۔ یہ تصویر امریکا کے مخالفین کو اس کے ساتھ تنازعات میں الجھنے سے پہلے بار بار سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ زیادہ تر لوگ اس کے ساتھ ڈیل کرنے کو ترجیح دیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ ٹرمپ مشرق وسطیٰ کو اپنے انداز سے نئی شکل دینا چاہتے ہیں۔ ان کے اور اقدامات کو اہم معاہدوں اور پابندیوں کے ذریعے دیکھیں گے، جنگوں میں گھرا ہوا اور تباہی کے قالب میں ڈھلے ہوئے نہیں۔ جیسا کہ ٹرمپ بار بار کہہ چکے ہیں کہ اپنے پچھلے دور صدارت میں ایک بھی جنگ کیے بغیر انہوں نے چار سال تک حکومت کی۔ ان کی حکمت عملی واضح اور سخت تھی مگر جنگ نہیں تھی۔ اس لیے وہ پابندیوں کے نفاذ میں پختہ رہے۔ اب ایک بار پھر خطے کو انہی تبدیلیوں کے لیے تیار ہونا چاہیے اور خود کو ان کے مطابق ڈھالنا چاہیے، جن کے ٹرمپ کی دوسری مدت صدارت میں دہرائے اور آگے بڑھائے جانے کے اشارے نظر آرہے ہیں۔

(بحوالہ: ''العربیہ اردو ڈاٹ نیٹ''۔ ۱۸ر نومبر ۲۰۲۴ء)

اونروا پر مُمکنہ اسرائیلی پابندی کے اثرات؟

Lubna Masarwa

اسرائیل فلسطینی پناہ گزینوں کے حقِ واپسی کو تسلیم کرنے والے واحد ادارے کو مٹانا چاہتا ہے، لیکن وہ فلسطینی جدوجہد کو کبھی دفن نہیں کر سکے گا۔

ہم میں سے جو لوگ دریا اور سمندر کے درمیان کی زمین میں رہتے ہیں، وہ ایک سانحے کے گونج کے ساتھ سو جاتے ہیں اور ایک نئے سانحے کا سامنا کرتے ہوئے جاگتے ہیں۔

گزشتہ ہفتے کے اوائل میں، اسرائیلی پارلیمنٹ کنیسٹ کے ۹۲/۱۲۰ اراکین نے دو قوانین منظور کیے جن کے تحت فلسطینی پناہ گزینوں کے لیے اقوام متحدہ کے ادارے ''اونروا'' پر پابندی عائد کیے جانے کی تجویز دی گئی ہے۔

یہ اقدام غزہ، مقبوضہ مغربی کنارے اور مقبوضہ یروشلم میں رہنے والے تین ملین افراد کو اسکولوں، بنیادی صحت کی سہولیات، ادویہ کی فراہمی، کوڑا کرکٹ جمع کرنے کی خدمات اور دیگر ضروری سہولیات سے محروم کرنے کی کوشش ہے۔

جنگ کے دوران ''اونروا'' پر پابندی غزہ میں بین الاقوامی امداد کے پورے نظام کو خطرے میں ڈال سکتی ہے، کیونکہ اقوام متحدہ کا یہ ادارہ ڈرائیوروں، ٹرکوں اور گوداموں کا وہ بنیادی ڈھانچا فراہم کرتا ہے جس پر تمام امدادی سرگرمیوں کا انحصار ہے۔

گزشتہ ہفتے یہ خبر بھی سامنے آئی کہ جبالیہ میں ایک ماہ سے کم عرصے میں ایک ہزار سے زیادہ افراد ہلاک ہو چکے ہیں، اور کچھ دن بعد اقوام متحدہ کے بچوں کے تحفظ کے ادارے 'یونیسف'' نے رپورٹ دی کہ شمالی غزہ میں محض دو دنوں میں ۵۰ سے زائد بچے قتل کیے گئے ہیں۔

اس قتلِ عام کے بعد اسرائیل کی جانب سے دو مزید حملے کیے گئے، جن میں ایک پولیو ویکسی نیشن کلینک اور اقوام متحدہ کے ایک امدادی کارکن کی گاڑی کو نشانہ بنایا گیا، جس کے نتیجے میں کم از کم تین بچے زخمی ہوئے جو حفاظتی ٹیکے لگوانے کے انتظار میں تھے۔ یہ حملے ایسے وقت میں کیے گئے جب اسرائیل نے ''انسانی ہمدردی کی بنیاد پر'' وقفے کا اعلان کیا تھا۔

کنیسٹ میں ہونے والی ووٹنگ نے اسرائیل کے سیاسی عزائم اور اثرات کو نمایاں کر دیا ہے۔ کسی وزیرِ اعظم یا حکومت کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ انتہائی دائیں بازو کے دباؤ میں ہے۔ یہ اقدامات تمام تر اسرائیلی سیاستدانوں کے نظریات کی ترجمانی کرتا ہے اور اسی لیے اسرائیل مجموعی طور پر ایسے سنگین نتائج کا خود ذمہ دار ہے۔

''اونروا'' پر پابندی کے ووٹ سے اسرائیلی سیاست دانوں کی یکجائی ظاہر ہوتی ہے اور اسی لیے اسرائیل مجموعی طور پر اس اقدام کے انتہائی سنگین نتائج کا ذمہ دار ہے۔

مجھے یہ بات نہایت حیران کن لگی کہ انہوں نے اس پابندی کو ۷/اکتوبر کے ردِعمل کے طور پر کس حد تک کامیابی سے پیش کیا، ان الزامات کی بنیاد پر کہ ''اونروا'' کے عملے نے حماس کے حملوں میں حصہ لیا تھا، حالانکہ اسرائیل ان الزامات کے شواہد پیش کرنے میں ناکام رہا ہے۔

اس بل کی تجویز کرنے والوں میں سے ایک، نیشنل یونٹی پارٹی کی کینیڈین نژاد شیریں ہاسکل ہے، جو کبھی کنیسٹ کی سب سے کم عمر رکن تھیں، انہوں نے کہا: ''دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں ہو سکتا جہاں کسی بین الاقوامی تنظیم کے ملازمین اس کے شہریوں کے قتلِ عام میں شریک ہوں اور وہ تنظیم اس سرزمین پر ایک دن کے لیے بھی موجود رہے''۔

ہاسکل اس معاملے پر کنیسٹ کی سب سے سرگرم رکن ہیں۔ انہوں نے یو این آر ڈبلیو اے اصلاحاتی منصوبے کا آغاز کیا۔ جب سابق امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے اس ادارے کی مالی امداد میں کمی کی، تو ہاسکل نے دنیا بھر میں مہم چلائی تاکہ اس فنڈ میں مزید کمی کی جائے۔

اسرائیلی سیاستدان یوعز ہینموت، جو پہلے صحافی تھے اور اب لیکوڈ پارٹی کے رکن ہیں، نے بھی اس موضوع پر بات کرتے ہوئے کہا کہ ''یو این آر ڈبلیو اے کا مطلب حماس ہے، بس۔''

جو لوگ اس مسئلے کی حقیقت سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ''اونروا'' پر پابندی عائد کرنے کی کوششوں کا حماس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

''اونروا'' کے خلاف پابندی کی مہم کا آغاز کم از کم دو دہائیاں پہلے اُس وقت ہوا جب ''اونروا'' نے یروشلم میں ایک کمپلیکس تعمیر کیا۔ ۲۰۰۴ء میں، اسرائیلی کنیسٹ کے رکن نیسان سلومنسکی نے اس کمپلیکس کے محاصرے کی تجویز پیش کرتے ہوئے کہا: کہ ''اقوام متحدہ خود کو دنیا کا حکمران سمجھتا ہے۔''

اس معاملے پر اسرائیل کے نام نہاد مرکز اور بائیں بازو کا موقف بھی وہی ہے جو دائیں بازو کا ہے۔ ۲۰۱۲ء میں جب یائر لاپید نے سیاست میں قدم رکھا، جو ۲۰۲۲ء میں اسرائیل کے وزیرِ اعظم بنے، تو انہوں نے چینل ۷ پر کہا: ''واپسی کا کوئی حق نہیں ہے۔ پہلے وہ ۱۹۴۸ء کے پناہ گزینوں کی بات کرتے تھے۔ فلسطینی کیوں دنیا کی واحد قوم ہوں جو دوسری نسل کے پناہ گزین ہونے کا دعویٰ کرے؟''

یقیناً، یائر لاپید جیسے اسرائیلی، فلسطینیوں کے زمین پر ان کے جائز دعووں اور نسل در نسل حق واپسی کو مسترد کرتے ہیں، جبکہ دوسری جانب وہ خود یہودیوں کے ہر نسل اور پس منظر سے تعلق رکھنے والے افراد کے ''واپسی کے حق'' کو ہزاروں سال پرانے واقعات کی بنیاد پر جائز ٹھہراتے ہیں۔

''اونروا'' کے وجود کے حق کو ۲۰۲۱ء میں دوبارہ چیلنج کیا گیا جب یروشلم کے میئر نیر برکات نے اقوام متحدہ کی اس ایجنسی کو شہر سے نکالنے کے لیے ایک بل پیش کیا۔

''اونروا'' پر پابندی اس لیے لگائی جا رہی ہے کیونکہ یہ واحد ایجنسی ہے جو فلسطینی پناہ گزینوں اور ان کی نسلوں کے حق واپسی کو تسلیم کرتی ہے۔

اگر آپ ''اونروا'' کو ختم کر دیں تو پناہ گزینوں کا مسئلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ پناہ گزینوں کو مٹائیں، تو حق واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، سوائے یہودیوں کے، جن کا حق بہر حال برقرار رکھا جائے۔

چنانچہ عایدہ تومالسلیمان، جو حدش پارٹی سے تعلق رکھنے والی ایک فلسطینی کنیسٹ رکن ہیں، نے اس اقدام کے بنیادی مسئلے پر براہِ راست بات کی کہ اسرائیل پناہ گزینوں کو ختم کرنا چاہتا ہے جبکہ خود ہر ممکن طریقے سے مزید پناہ گزین پیدا کر رہا ہے۔

انہوں نے کہا: ''کوئی بھی فلسطینی پناہ گزین بننا نہیں چاہتا۔ ریاستِ اسرائیل فلسطینی پناہ گزینوں کی تعداد میں مزید لاکھوں کا اضافہ کر رہی ہے۔ غزہ کے ۹۰ فیصد رہائشی پناہ گزین بن چکے ہیں۔''

محاصرہ مکمل طور پر سخت کر دیا جائے گا۔

تعل پارٹی کے رہنما احمد طبی نے پلیٹ فارم ایکس پر لکھا کہ فلسطینی پناہ گزینوں کے حقوق کو مسترد کرنے والے قوانین ''فلسطینی عوام کو تسلیم کرنے سے انکار کا حصہ ہیں۔''

جیسا کہ اب عام روایت بن چکی ہے، بینی گینٹز کے نیشنل

یونٹی کیمپ نے اس کھلی فرقہ وارانہ بحث میں یہودی اور فلسطینی فریقوں کے درمیان انتخاب میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔

اپنے ایک بیان میں انہوں نے کہا: ''احمد طبی اور بیبی [وزیراعظم بنجمن نیتن یاہو] کے درمیان انتخاب میں ہم ریاست کے مفاد کو تمام دیگر عوامل پر مقدم رکھیں گے اور حکومت کو گرانے کی اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔

ایسے لمحات ان مغربی حلقوں کے لیے محفوظ کیے جانے چاہئیں جو یہ تاثر دیتے ہیں کہ نیتن یاہو کے بعد گینٹز کے زیرِ قیادت دور فلسطینی ریاست کے قیام کا سبب بنے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔

ان کنیسٹ اراکین کی اکثریت کے لیے جنہوں نے ان بلوں کے حق میں ووٹ دیا، یہ حقیقت کہ دنیا انہیں ایسا نہ کرنے کا کہہ رہی تھی، جب کہ ان کے پاس ان بلوں کو منظور کرنے کے لیے کافی جواز تھا۔ یش عتید کی میراؤ بن آری نے ان قوانین کی منظوری کو قومی اتحاد کا ایک اہم موقع قرار دیا۔

لیکن فلسطینیوں کے لیے یہ قوانین تباہ کن ہیں۔ امدادی تنظیم ''ایکشن فار ہیومینٹی'' کے چارلس لاولی نے مڈل ایسٹ آئی کو بتایا: ''میرا خیال ہے کہ غزہ میں امداد کا پورا نظام منہدم ہو جائے گا۔ اگر یہ عمل آگے بڑھا تو یہاں زندگی کا معیار قرونِ وسطیٰ کی سطح پر پہنچ جائے گا۔''

میں نے فلسطینی کارکن سہیل سلیمان کے ساتھ نورشمس پناہ گزین کیمپ کا دورہ کیا، جہاں ایک بلڈوزر نے واحد طبی کلینک کو تباہ کر دیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا، ''اگر اسرائیل اقوام متحدہ کی کسی تنظیم کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کرتا ہے، تو اسے اقوام متحدہ سے نکال دینا چاہیے''۔

سیاسی تجزیہ کار امیر مخول نے اس پابندی کو اسرائیل کے اس خوف سے جوڑا کہ اسے پناہ گزینوں کے انجام کے حوالے سے اسے قانونی جوابدہی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ فلسطینیوں اور عربوں کے لیے ایک موقع فراہم کر سکتا ہے۔ پناہ گزینوں کا مسئلہ ایک بار پھر ایک بین الاقوامی مسئلہ بن سکتا ہے اور اسرائیل پر دباؤ ڈالنے کا ایک اہم ذریعہ بن سکتا ہے۔

تاہم اس وقت فلسطینیوں کو موجودہ حالات میں زندہ رہنے کی جدوجہد کرنی ہے۔ جب یہ پابندی نافذ ہو جائے گی تو اسرائیل ''اونروا'' کے کسی بھی ملازم یا اس سے وابستہ افراد کو اپنی سرحدی گزرگاہوں اور چیک پوسٹوں سے گزرنے سے روک سکتا ہے۔

اس طرح تمام فلسطینی دیہات اور قصبے ایک مکمل اور ناقابل رسائی محاصرے میں آ جائیں گے۔

لیکن اسرائیل پناہ گزینوں کی تمام علامتوں کو ختم کرنے کی کوشش کر لے، پھر بھی وہ فلسطینی آزادی کی جدوجہد کو ختم کرنے یا فلسطینی قوم کو مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ ان کی مساجد، گرجا گھر اور تاریخی مقامات آج بھی مضبوطی سے قائم ہیں۔

(مترجم: محمود الحق صدیقی)

"Israel's Unrwa ban will be devastating for Palestinians".
("middleeasteye.net". November 5, 2024)

بقیہ: اسرائیل پر عالمی ایف آئی آر

زبانی جمع خرچ بہت کیا ہے۔ یورپی یونین میں اس حوالے سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ فرانس اور اُس کے ہم نوا اب بھی اسرائیل کے خلاف کچھ بولنے کے لیے تیار نہیں۔ لازم ہو چکا ہے کہ اب منافقت ترک کی جائے، لگی لپٹی کے بغیر حقیقت کو بیان اور تسلیم کیا جائے اور اسرائیل کو وہ سب کچھ کرنے سے روکا جائے جو وہ ایک سال سے بھی زائد مدت سے کرتا آیا ہے۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"UN special committee likens Israeli policy in Gaza to genocide".
("The Guardian". November 14, 2024)

امریکی صدر جس نے اسرائیل کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا

رضی الدین سید

اسرائیل آج امریکا کے لیے خود اس کی اپنی ایک ریاست کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو مطالبہ بھی چاہے، امریکی حکومت سے منوا سکتا ہے۔ قیام اسرائیل کے بعد ہی سے امریکا کا ہر صدر خود کو اسرائیل کا فرماں بردار ثابت کرتا رہا ہے کیونکہ انہی کی سازشوں کے تحت یہ ریاست وجود میں آئی تھی۔ البتہ امریکی تاریخ میں ایک صدر ایسا بھی گزرا ہے جس نے اسرائیل کو اپنے آگے گھٹنے ٹیکنے اور ناک رگڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسرائیل کے ساتھ اس نے نہ صرف یہ کہ ہر دھونس، دباؤ اور غیر قانونی اقدام پر کسی بھی قسم کے سمجھوتے سے صاف انکار کیا تھا، بلکہ الٹا اُسی پر دباؤ ڈالا تھا کہ تمام ناجائز اقدام فوری طور پر واپس لے ورنہ اس کا حشر برا کر دیا جائے گا۔ اس جرأت مند امریکی صدر کا نام 'ڈوائٹ ڈی آئزن ہاور' ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے بحران کا تذکرہ کرتے ہوئے دنیا میں نہ جانے کیوں آئزن ہاور کا ذکر نہیں کیا جاتا؟

اکتوبر ۱۹۵۶ء کی بات ہے، جب اسرائیل نے برطانیہ اور فرانس کے ساتھ مل کر ایک خفیہ معاہدہ کیا کہ یہ تینوں ممالک مل کر مصر پر مشترکہ حملہ کریں گے اور مصر کے صدر ناصر کا تختہ الٹ دیں گے۔ برطانیہ اور فرانس، امریکا کے حلیف تھے، چنانچہ اصولی طور پر ایسی کسی کارروائی سے قبل ان تینوں ممالک کو امریکا کے ساتھ لازماً مشاورت کرنی چاہیے تھی۔ لیکن انہوں نے امریکا کو اس بارے میں مطلع کرنے سے پہلوتہی اختیار کی۔ ۲۹/اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اسرائیل نے حملہ شروع کیا اور ۷/نومبر تک جاری رکھا۔ صدر کرنل ناصر نے نہر سوئز کو انہی دنوں اپنے قبضے میں لیا تھا۔ تینوں ممالک کا منصوبہ یہ تھا کہ اسرائیل صحرائے سینا پار کر کے نہر سوئز کی طرف بڑھے گا، جبکہ برطانیہ اور فرانس فضائی بمباری کرتے ہوئے شمال کی جانب سے مصر پر حملہ آور ہوں گے۔ حملے کو امریکا سے خفیہ رکھنے کی خاطر اسرائیل نے واشنگٹن میں اپنے سفیر کو ہدایت جاری کی کہ ظاہر کیا جائے کہ مسلح افواج کی یہ نقل و حرکت محض حفاظتی نقطۂ نظر سے ہے اور مصر پر حملے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تینوں ممالک سمجھتے تھے کہ روایتی طور پر صدر آئزن ہاور اپنے سابقہ جنگی حلیفوں (برطانیہ اور فرانس) کی اعلانیہ مخالفت نہیں کرے گا۔

تاہم صدر امریکا کو جب اس خفیہ حملے کی اطلاع ملی تو بہت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اس نے اسرائیل کو دھمکی دی کہ وہ امریکی امداد بند کر دے گا۔ سیکرٹری آف اسٹیٹ 'جان فوسٹر' کو اس نے تحکمانہ انداز سے ہدایت جاری کی کہ ''فوسٹر، انہیں بتا دو کہ ہم ان کے خلاف پابندیاں عائد کریں گے۔ ہم یہ معاملہ اقوام متحدہ میں اٹھائیں گے۔ اور ہر وہ اقدام کریں گے جس سے یہ حملہ رک جائے''۔ آئزن ہاور نے مزید یہ بھی کہا کہ ہم نے اسرائیلیوں کو واضح طور پر بتا دیا ہے کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ میں ہماری حمایت حاصل کریں، تو انہیں اپنے رویے میں لازماً اصلاح کرنی ہوگی۔

تاہم اسرائیل، برطانیہ اور فرانس، تینوں نے امریکا کی دھمکیوں کی مطلق پروا نہ کی اور اپنے حملے جاری رکھے۔ آخرکار مجبور ہو کر صدر آئزن ہاور نے دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانے کا

فیصلہ کیا اور پہلے قدم کے طور پر ہر قسم کی اسرائیلی امداد پر پابندی لگادی۔ اس کے بعد ہی جا کر اسرائیل کو سمجھ میں آیا کہ آئزن ہاور اپنی دھمکیوں میں سنجیدہ ہے۔ چنانچہ مجبور ہو کر اس نے مصر پر حملہ روکا اور فوجوں کو اپنے اپنے مقام پر ٹھہرا دیا۔ فرانس اور برطانیہ نے بھی اسرائیل کی پیروی کی اور شمالی علاقوں پر حملے بند کر دیے۔ مصر پر تین ممالک کا یہ مشترکہ حملہ رکوانا صدر آئزن ہاور کی بہت بڑی کامیابی تھی، باوجود اس کے کہ برطانیہ اور فرانس خود امریکا کے حلیف تھے، اور جبکہ مصر اپنی وابستگی امریکا مخالف روس کے ساتھ رکھے ہوئے تھا۔

تاہم آئزن ہاور محض جنگ بندی پر خوش نہ تھے، کیوں کہ حملہ روک دینے کے بعد بھی اسرائیل نے مصر کی اہم بندرگاہ ''شرم الشیخ'' اور اس کے زیر انتظام ''غزہ کی پٹی'' پر غاصبانہ فوجی قبضہ برقرار رکھا تھا اور وہاں سے پیچھے ہٹنے کو مطلق تیار نہ تھا۔ امریکا کے کہنے پر اقوام متحدہ نے بھی مقبوضہ علاقے خالی کرانے کی چھ قراردادیں منظور کر لی تھیں۔ لیکن اسرائیل نے ان میں سے کسی ایک کی بھی پروا نہ کی۔ یہ وہ دور تھا جب آئزن ہاور اپنے صدارتی انتخاب کی مہم کے آخری مرحلے میں کھڑا تھا۔ امریکی مبصرین اندازہ کر رہے تھے کہ اسرائیل پر جو دباؤ وہ ڈال رہے ہیں اس کے سبب آئزن ہاور اپنا انتخاب ہار جائیں گے۔ (امریکی یہودی جس امیدوار کو بھی ووٹ دینے سے دست کش ہو جائیں، مشکل ترین ہے کہ پھر وہ اپنی نشست آسانی سے نکال لے)۔ لیکن حیرت انگیز طور پر آئزن ہاور نے یہ معرکہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ ووٹوں سے جیت لیا۔ ۱۹۵۲ء کے ۳۶ فیصد یہودی ووٹوں کے مقابلے میں ۱۹۵۶ء میں اسے ۴۰ فیصد ووٹ زیادہ ملے۔

بعد میں شرم الشیخ اور غزہ کی پٹی سے دست برداری کی خاطر صدر کا دباؤ ہٹانے کے لیے یہودیوں نے اب ایک دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اس نے آئزن ہاور پر سفارتی دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ چنانچہ ایک موقع ایسا بھی آیا جب آئزن ہاور سے سابق امریکی صدر روز ویلٹ کی بیوہ، سابقہ متصل صدر ٹرومین اور سینیٹ میں ڈیموکریٹک اور ریپبلکن سینیٹرز نے بذاتِ خود ملاقات کی اور اس سے اپنا 'اصرار' واپس لینے کی درخواست کی۔ ادھر سیکرٹری آف اسٹیٹ جان فوسٹر ڈلس کو بھی انہوں نے یہ الفاظ ادا کیے کہ: ''اس طرزِ عمل سے ہمارے اور امریکا کے راستے جدا ہو جائیں گے''۔ لیکن ڈلس نے بھی دوبدو جواب دیتے ہوئے نرمی سے کہا: ''آپ حضرات اپنی دھمکی پر ذرا غور کریں۔ ظاہر ہے کہ امریکا کی تمام پالیسیاں یروشلم میں تو تشکیل نہیں دی جاسکتیں!''

ڈلس نے مزید کہا کہ: ''مجھے معلوم ہے کہ اس ملک میں یہودی حمایت سے عاری خارجہ پالیسی پر عمل کرنا کس قدر دشوار ہے، لیکن پھر بھی میں ایک آزاد پالیسی تشکیل دینے کی کوشش ضرور کروں گا''۔ اس نے کہا کہ: ''اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں کوئی اسرائیل دشمن فرد ہوں۔ بلکہ میں تو 'جارج واشنگٹن' کے ان الفاظ پر یقین رکھتا ہوں کہ جذباتی وابستگی کو ملکی معاملات پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے''۔

۱۹۵۷ء میں صدر آئزن ہاور نے ٹی وی پر امریکی عوام سے مخاطب ہوتے ہوئے واضح طور پر کہا کہ:

''ایک ملک جو حملہ آور بھی ہو اور جو اقوام متحدہ کی ممانعت کی پروا کیے بغیر غیر ملکی علاقے (مصر) پر قبضہ بھی جاری رکھے، اسے کیا خود ساختہ شرائط منوانے کی اجازت دی جاسکتی ہے؟''۔ اس نے مزید کہا کہ: ''اگر ہم یہ بات مان لیں کہ جارحیت سے، جارحیت کرنے والے ملک کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے، تو میرے خیال میں عالمی نظام کو ہم جنگلی نظام کی طرف دھکیل رہے ہیں''۔

ہاور کی اس تقریر کے بعد وائٹ ہاؤس میں یہودیوں کی جانب سے خطوط اور تاروں کا تانتا بندھ گیا جن میں سے ہر خط اسرائیلی اقدام کی حمایت، اور امریکی صدر کی مذمت میں تھا۔ لیکن جرأت مند یہ صدر مردِ استقلال بنا رہا۔ بلکہ اُلٹا اس نے مزید دھمکی دی کہ اگر اسرائیل نے جزیرہ نما سینائے اور غزہ کی پٹی خالی نہ کی تو اقوام متحدہ میں امریکا اسرائیل کے خلاف پابندیوں کی قرارداد کی نہ صرف یہ کہ حمایت کرے گا بلکہ اسرائیل کے لیے ملک میں جمع کیے جانے والے عطیات پر انکم ٹیکس سے چھوٹ کی رعایت بھی واپس لے لے گا۔

لہٰذا بالآخر آئزن ہاور کی ضد اور اصول پسندی نے اسرائیل کو اس کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر ہی دیا۔ شرم الشیخ اور غزہ کی پٹی اسے بالآخر خالی کرنی ہی پڑی۔ صدر امریکا کے اس جرأت مندانہ کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے بعد میں اس کے سوانح نگار ''اسٹیفن ای ایمبروز'' نے لکھا کہ: ''اقوام متحدہ پر صدر کی برتری کا اصرار، معاہدوں کی پاس داری اور تمام اقوام کے حقوق پر زور دینے کے باعث، امریکا کا وقار تب اس قدر بلند ہوا تھا کہ ویسا وقار اس کا پہلے کبھی موجود نہیں تھا''۔ ادھر قاہرہ سے امریکی سفیر 'ریمنڈ ہیئر' نے بھی وائٹ ہاؤس کو تار بھیجا کہ: ''امریکا آج یکا یک سچ کا چیمپئن بن کر ابھرا ہے''۔

امریکا کے بارے میں یہ دو قیمتی تبصرے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

صدر آئزن ہاور نے ایک اور معاملے پر بھی اسرائیل کو اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور کیا تھا۔ یہ تھا اسرائیل کا 'یروشلم' کو اپنا دارالحکومت قرار دینا۔ حالانکہ اسے آج تک ایک بین الاقوامی شہر تسلیم کیا جاتا ہے جس پر عیسائیوں، مسلمانوں اور یہودیوں تینوں کا مشترکہ حق ہے۔ آئزن ہاور نے اسرائیلی دارالحکومت کی تل ابیب سے یروشلم منتقلی کو ہرگز پسند نہیں کیا تھا اور اپنے سفارت خانے کو واضح ہدایات جاری کی تھیں کہ 'یروشلم میں اسرائیلی حکام سے مذاکرات ہرگز نہ کیے جائیں'۔ تل ابیب سے یروشلم کو منتقلی (جولائی ۱۹۵۳ء میں) اسرائیل کی ایک سیاسی چال تھی۔ عالمی سفارت کاروں سے وہ یروشلم کی اسرائیلی حیثیت کو تسلیم کروانا چاہتا تھا۔ صدر آئزن ہاور کے احکامات پر اس معاملے پر بھی امریکی وزیر خارجہ جان فوسٹر ڈلس نے اسرائیلی دباؤ برداشت کرنے سے یکسر انکار، اور اسرائیل کو پسپا ہونے پر مجبور کیا تھا۔

واضح رہنا چاہیے کہ آئزن ہاور کے دور میں اسرائیل کا وزیر اعظم ڈیوڈ بن گوریان تھا جس کے بارے میں اس کے قریبی ساتھیوں کا کہنا تھا کہ بن گوریان کی زندگی کا سب سے مشکل سیاسی مرحلہ امریکی صدر کے سخت احکامات پر عمل درآمد کرنا تھا۔ (کتاب 'اسرائیل کی دانستہ فریب کاریاں، از: پال فنڈلے۔ مترجم سعید رومی ص ۸۶۔ و۔ 4.VUSAEncyclopedia Collier's)

گزشتہ دور میں ایک اور سابق 'صدر جمی کارٹر' کے دل میں بھی آئزن ہاور بننے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ایک ایسا صدر ثابت ہونا چاہتا ہے جو اسرائیل کے کسی بھی دباؤ میں نہیں آئے گا۔ صدارت سنبھالنے کے بعد اس کی دلی تمنا تھی کہ وہ فلسطینیوں کے لئے بھی ایک علیحدہ خود مختار وطن قائم کروالے۔ لیکن یہودی لابی نے اسے چین سے نہ بیٹھنے دیا اور اس پر اتنا شدید دباؤ ڈالا کہ 'کارٹر' جلد ہی اپنے تمام خیالات سے تائب ہوگیا۔

مشرق وسطیٰ کی تاریخ پڑھنے والوں کو سابق امریکی صدر آئزن ہاور کے اس مجاہدانہ کردار کو بھی ذہین نشین رکھنا چاہیے۔ آج ساری دنیا میں امریکی وقار پامال ہے اور ہر جگہ اس کے پرچم پیروں تلے روندے جا رہے ہیں۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا فرد ہو، جسے امریکا سے نفرت نہ ہو۔ امریکا آج جھوٹ کا چیمپئن بنا ہوا ہے۔ لیکن اگر کوئی امریکی صدر آج بھی اسرائیل کے مقابلے میں سچائی و انصاف پر ڈٹ جائے، تو امریکا کا وقار آج بھی بلند ہوسکتا ہے۔

غزہ: مُنظّم نسل کشی کے ۴۰۰ دن کیسے گزرے؟

غزہ۔ مرکز اطلاعات فلسطین

غزہ کے محصورین اور مقہورین کے پاس دنیا کا مادی اسلحہ اور تباہی پھیلانے والا گولا بارود نہیں مگر نہتے فلسطینی ایمان اور استقامت کی دولت سے ضرور مالا مال ہیں۔ سات اکتوبر ۲۰۲۳ء کے بعد غزہ کے مظلوم عوام جس ہولناک جنگ سے گزر رہے ہیں، اس کا تصور بھی محال ہے۔ انہوں نے پوری استقامت، بہادری اور ثابت قدمی کے ساتھ دشمن کی رعونت اور استکبار کا سامنا کیا۔

غزہ کی گنجان آباد بستی کو کھنڈرات کے ڈھیر میں بدل دیا گیا اور فلسطینی قوم کو ان ہی کے وطن میں ایک بار پھر غریب الوطنی کے حالات سے دوچار کیا گیا۔

قابض صہیونی افواج کی لاقتناہی اور نہ ختم ہونے والی جارحیت نے غزہ کی پٹی میں شمال سے جنوب تک ہر سو جرائم کا ارتکاب جاری رکھے ہوئے ہیں۔ قتل و غارت گری کے متوازی اپنے مجرمانہ منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے فاشسٹ دشمن شہری آبادی پر فاقہ کشی اور قحط کو ایک جنگی ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ فلسطینیوں کے بے رحمانہ اور منصوبہ بند قتل عام پر عرب اور مسلمان ممالک کے حکمران بے حسی کی چادر اوڑھے غزہ میں بہتی خون کی ندیوں کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔

مایوسی کے باوجود صبر اور استقامت

احمد ابو اسامہ وسطی غزہ کے شہر خان یونس کے علاقے مواصی کے ایک خیمے میں رہ رہے ہیں۔ انہوں نے ہمارے نامہ نگار کو بتایا کہ ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ جنگ اتنی دیر تک جاری رہے گی، لیکن یہ خدا کی تقدیر ہے اور ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس صبر اور ثابت قدمی کے سوا کچھ نہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ خدا ہمیں مایوس نہیں کرے گا اور یہ قربانیاں پھل ضرور لائیں گی۔ فلسطینی قوم اس وقت جس آزمائش اور مشکل سے گزر رہی ہے، اس تاریک شب کی سحر جلد طلوع ہوگی۔

ابو اسامہ نے عرب اور مسلمان ممالک کی طرف سے اختیار کردہ مایوسی اور بین الاقوامی خاموشی پر افسوس کا اظہار کیا۔ عرب ممالک اور مسلمان ملکوں نے ہمیں تنہا چھوڑ دیا۔ اسرائیلی قتل عام کے سامنے جوان، عورت، بوڑھے، بچے سب برابر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ حماس اور مزاحمت سے لڑ رہے ہیں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ وہ ہمارے بچے بچے کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے وطن کو نہیں چھوڑیں گے۔

غزہ میں جاری منظم نسل کشی کی جنگ کے ۴۰۰ دنوں کے دوران قابض فوج نے ۳۷۹۸ بار اجتماعی قتل عام کیا، جس کے نتیجے میں ۵۳،۵۵۲ فلسطینی شہید اور لاپتا ہو چکے ہیں۔ ۱۰،۰۰۰ فلسطینی لاپتا ہیں۔ ۵۵،۲۴۳ شہداء کے جسد ہائے خاکی اسپتالوں میں پہنچائے گئے۔ ان میں سے ۱۷،۳۸۵ بچے شہید جن میں ۲۰۹ شیر خوار بچے شامل ہیں۔ شہید ہونے والے ۸۲۵ فلسطینی بچوں کی عمر ایک سال سے کم تھی۔

شمالی غزہ کو خالی ہونے کی پالیسی کا سامنا

نسل کشی کی جنگ کے ۴۰۰ ایام میں غزہ پٹی کے باشندوں کو کئی خطرناک موڑوں سے گزارا گیا۔ شمالی غزہ گورنری کی آبادی کو مکمل طور پر خالی کرنے کے اعلان کردہ ہدف کے تحت ۳۶ دنوں سے بڑے پیمانے پر جارحیت کا مشاہدہ کیا ہے۔ شمالی غزہ کی پٹی کی بڑی تعداد کو شہید یا گرفتار کر لیا گیا۔

سرکاری میڈیا کے اعداد و شمار کے مطابق ۳۶ دنوں کے دوران شمالی غزہ میں تقریباً ۱۹۰۰ شہری شہید، ۴ ہزار سے زائد زخمی اور سیکڑوں کو گرفتار کیا گیا، اس کے علاوہ ہزاروں گھر تباہ ہوئے۔

ہمارے نامہ نگار کو عینی شاہدین نے اطلاع دی ہے کہ قابض فوج شمالی غزہ کے محلوں میں ایک چوک سے دوسرے چوک تک نسلی تطہیر کے جرائم کا ارتکاب کر رہی ہے۔ مکانات کو دھماکے سے اڑایا جا رہا ہے، ان کے مکینوں کے سروں پر بمباری کی جا رہی ہے اور ان میں سے زخمی ایمبولینسوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے شہید ہو رہے ہیں۔

اس علاقے میں زندہ بچ جانے والی ایک خاتون کا کہنا ہے کہ جبالیہ کیمپ میں ہم جس اسکول میں تھے، اس پر بمباری کے بعد انہوں نے ہمیں ۲۵ دن سے زیادہ وقت تک بھوکا اور پیاسا رکھا۔ اسکول پر بمباری کے نتیجے میں ۱۰ افراد شہید ہو گئے۔ ہم بمباری کی زد میں آ گئے۔ قابض فوج نے کیمپ کے دسیوں جوانوں کو اغوا کر لیا۔

اس نے مزید کہا کہ جب ہم اسکول میں تھے ہم نے دھماکوں، گھروں کو اڑانے اور انہیں جلانے کی آوازیں سنیں، یہ واضح ہے کہ وہ بغیر کسی وجہ کے ان کے سامنے سب کچھ تباہ کر رہے ہیں۔

اگرچہ قابض فوج اعلان کرتی پھرتی ہے کہ وہ جرنیلوں کے منصوبے پر عمل درآمد نہیں کر رہی ہے، جس میں شمالی غزہ کے مکینوں کو بے گھر کرنے، وہاں کی مزاحمت کاروں کا محاصرہ کرنے اور انہیں ہتھیار ڈالنے یا قتل کرنے کی کوشش ہے۔

اب تک شمال کے ہزاروں باشندے ثابت قدم ہیں اور ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں منتقل ہو رہے ہیں۔

سب سے بڑا قتل عام

نسل کشی کے ۴۰۰ روز بعد یورو۔ میڈیٹرینین ہیومن رائٹس آبزرویٹری کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رامی عبدہ نے بتایا کہ ایسا کوئی جرم یا خلاف ورزی باقی نہیں رہی جس سے یہ تصور کیا جا سکے کہ ''اسرائیل'' نے خوفناک اور تباہ کن توسیع کے ساتھ مشق نہیں کی ہے۔

انہوں نے مزید کہا کہ آج ہمارے پاس ۲۰ لاکھ بے گھر لوگ ہیں جو زبردستی بے گھر ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس قابض صہیونی فوج کے ہاتھوں نہتے فلسطینیوں کے قلیل مدت میں سب سے بڑے قتل عام کا ریکارڈ ہے جس میں ۵۰ ہزار سے زیادہ شہری شہید ہو چکے ہیں۔ ان میں سے نصف سے زیادہ خواتین اور بچے ہیں۔ ہمارے پاس ماورائے عدالت قتل اور من مانی قتل کے بھیانک جرائم کے ثبوت ہیں، جن میں سفید جھنڈے اٹھانے والوں کو قتل کرنا، قیدیوں کو قتل کرنا، ان پر تشدد کرنا، ان کی عصمت دری کرنا اور انہیں انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کرنا شامل ہے۔

بھوک کا ہتھیار

قتل عام اور بے گھر کرنے کے جرم کے علاوہ قابض صہیونی فوج غزہ میں فلسطینیوں کے خلاف بھوک کو جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔ یہ سب سے زیادہ تکلیف دہ ہتھیاروں میں سے ایک لگتا ہے جب کہ دنیا اس گھناؤنے جرم کو دیکھتے ہوئے بھی آنکھیں بند کیے ہوئے ہے۔

تقریباً ۴۰ دن بغیر کسی امداد کے شمالی غزہ کے باشندوں کو بھوکا پیاسا رکھا گیا۔ جنوب کے باشندوں کو قحط کے ایک اور چکر کا سامنا ہے، کیونکہ بازاروں سے سامان ختم ہو چکا ہے۔ جو کچھ بچا ہے اس کی قیمتیں شہریوں کی خریداری کی استطاعت سے کئی گنا بڑھ گئی ہیں۔

غزہ کے فلسطینی گزشتہ چار سو روز سے ظلم کی ہر شکل کا سامنا کر چکے ہیں اور مسلسل کر رہے ہیں مگر ان کے پائے استقامت میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی۔ پورے پورے خاندان ختم کر دیے گئے اور ان کی نسل مٹا دی گئی۔ تشدد اور انسانیت سوزی کا ہر حربہ برداشت کر رہے ہیں مگر دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بجائے سینہ سپر ہیں۔

(بحوالہ: "urdu.palinfo.com"۔ ۱۴ نومبر ۲۰۲۴ء)

نوجوان مرد و خواتین میں بڑھتی تقسیم، وجہ کیا ہے؟

پولینڈ کے دارالحکومت وارسا کی ایک مصروف فوڈ مارکیٹ میں دو خواتین انجینئر اس موضوع پر گفتگو کر رہی ہیں کہ ایک اچھے مرد کی تلاش مشکل کیوں ہے؟ پالینا ناسیلوسکا کی تنخواہ میں گزشتہ چند برسوں میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ ناسیلوسکا کی دوست جوآنا والزیک یاد کرتے ہوئے بتاتی ہے کہ اس کی ملاقات Tinder پر ایک مرد سے ہوئی، جس نے اسے بتایا کہ وہ red-pill مرد ہے۔ (واضح رہے، یہ اصطلاح مشہور امریکی فلم ''دی میٹرکس'' سے اخذ کردہ ہے، جس کا مطلب ہے، ایسا فرد جو واضح طور پر حقیقت دیکھ سکتا ہے۔ اس وقت manosphere کے نام سے غصیلے مردوں پر مشتمل عالمی آن لائن کمیونٹی میں حقیقت سے مراد یہ ہے کہ ''مرد مظلوم ہیں'') اس کا خیال ہے کہ گھریلو کام کاج اور بچوں کی دیکھ بھال عورتوں کا کام ہے اور عورتیں لیڈر نہیں بن سکتیں۔ ان دونوں کی یہ آخری ملاقات تھی۔

عموماً پولینڈ کی نوجوان خواتین جیسے ناسیلوسکا اور والزیک لبرل لیفٹ کی جماعتوں کی حمایت کرتی ہیں، یہ جماعتیں خواتین کے مسائل کو سنجیدگی سے دیکھتی ہیں اور اسقاطِ حمل کو قانونی حیثیت دینے کا وعدہ کرتی ہیں۔ ان کو گلہ ہے کہ پولینڈ کے نوجوان دائیں بازو یا انتہائی دائیں بازو کی طرف زیادہ جھکاؤ رکھتے ہیں۔ گزشتہ سال کے انتخابات پر غور کیجیے۔ ۱۸ سے ۲۹ سال کے مردوں کے لیے اوّلین انتخاب کنفیڈریشن تھی۔ یہ پارٹی آزاد منڈی کی معاشیات اور روایتی سماجی اقدار کو فروغ دیتی ہے۔ (اس جماعت کا ایک نعرہ ہے کہ 'فیمینسٹ تحریک کے خلاف اور حقیقی عورت کے دفاع میں') تقریباً ۲۶ فیصد مرد اس کے حامی ہیں جبکہ صرف ۶ فیصد خواتین نے اس کا ساتھ دیا۔

پولینڈ کے نوجوان مردوں کی اپنی شکایات ہیں۔ ایک چھوٹے قصبے کے بیس سالہ فائر مین کا کہنا ہے کہ فیمینزم بہت آگے جا چکا ہے۔ لوکاز کہتا ہے، وہ اپنے گاؤں کی ڈانس پارٹی میں جایا کرتا تھا جہاں اکثر خواتین بڑی عمر کی ہوا کرتی تھیں۔ آج وہ خواتین سوشل میڈیا پر اپنی حیا باختہ تصاویر شیئر کر رہی ہیں۔ ماٹیوژ (کوئی بھی مرد اپنا خاندانی نام نہیں بتاتا) کا کہنا ہے، ''تمام میڈیا متعصب ہے اور ہماری ثقافت کو بائیں بازو کے خیالات کی جانب دھکیل رہا ہے''۔ اب لوگ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مرد اور خواتین اکثر مختلف کام کرنا چاہتے ہیں۔

ترقی یافتہ دنیا میں نوجوان مردوں اور عورتوں کے رویوں میں تقسیم پیدا ہو رہی ہے۔ جریدے ''دی اکنامسٹ'' نے یورپین سوشل سروے، امریکی جنرل سوشل سروے اور کورین سوشل سروے کو استعمال کرتے ہوئے بیس امیر ممالک کے پولنگ ڈیٹا کا تجزیہ کیا۔ بیس سال پہلے ۱۸ سے ۲۹ برس کے مردوں اور عورتوں کے درمیان ایک تا ۱۰ کے خود پیمائش کردہ اسکیل پر بہت کم فرق تھا۔ لیکن ہمارے تجزیے سے پتا چلا کہ ۲۰۲۰ء میں یہ خلا ۰٫۷۵ تھا۔ یہ فرق کوئی تعلیمی ڈگری رکھنے اور نہ رکھنے والوں کی رائے کے فرق سے دوگنا ہے۔

دوسری جانب، ۲۰۲۰ء میں نوجوان مردوں میں خود کو قدامت پسند (کنزرویٹو) کے مقابلے میں لبرل کہلانے کے رجحان میں صرف دو فیصد پوائنٹس کے فرق کے ساتھ معمولی سا اضافہ ہوا۔ تاہم، نوجوان خواتین بہت زیادہ یعنی ۲۷ فیصد پوائنٹس کے فرق کے ساتھ دائیں سے زیادہ بائیں بازو کی جانب جھکاؤ رکھتی تھیں۔

بڑے ممالک میں ہم نے جائزہ لیا کہ نوجوان مرد نوجوان خواتین سے زیادہ قدامت پسند تھے۔ پولینڈ میں ایک تا ۱۰ کے اسکیل پر یہ خلا ۱٫۱ پوائنٹ تھا۔ امریکا میں ۱٫۴ کی نمایاں شرح تھی۔ فرانس میں ایک، اٹلی میں ۰٫۷۵، برطانیہ میں ۰٫۷۱، اور جنوبی کوریا میں ۰٫۷۴ تھی۔ مرد اور خواتین ہمیشہ دنیا کو مختلف انداز سے دیکھتے ہیں۔ تاہم حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سیاسی رائے میں بھی خلیج بڑھ گئی ہے، کیونکہ نوجوان خواتین زیادہ تیزی سے لبرل ہو رہی ہیں جبکہ مرد ایسے نہیں ہیں۔

نوجوان خواتین کے لیے کام کی جگہوں اور عوامی زندگی میں مواقع میں بے پناہ اضافے کی وجہ سے فیمنسٹوں کی ماضی کے مقابلے میں اب کامیابیاں زیادہ ہیں۔ وہ مردوں کے تشدد سے لے کر اسقاطِ حمل کے سخت قوانین (چند ممالک میں) اور گھریلو کام اور بچوں کی دیکھ بھال کے کاموں، عدم مساوات اور معاوضوں میں فرق کے بارے میں فکرمند ہیں۔ مرد بڑے پیمانے پر ان کی مدد کرتے ہیں۔ لیکن ایک خاطر خواہ تعداد اب بھی ایسا نہیں کرتی۔ نوجوان خواتین کی جانب سے لبرل ازم کو اختیار کرنے کی وجہ یہ احساس بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں اپنے حقوق کے لیے ابھی بہت کام کرنا ہے، اور اس پر ان کی سخت مخالفت ہوگی۔

مردوں اور خواتین کا یہ فرق ووٹنگ پیٹرن میں بھی بہت واضح ہے۔ ایک سروے سے پتا چلا کہ ۷۲ فیصد نوجوان امریکی خواتین جنہوں نے ۲۰۲۲ء کے ایوان نمائندگان کے انتخاب میں ووٹ دیا، نے ڈیموکریٹک امیدوار کی حمایت کی جبکہ ۵۴ فیصد نوجوان مردوں نے ایسا کیا۔ ۲۰۰۸ء میں یہ فرق بہت کم تھا۔ یورپ میں، جہاں انتخابات میں بہت سی جماعتیں حصہ لیتی ہیں، نوجوان خواتین نے زیادہ تر بائیں بازو کی جماعت کی حمایت کرنا پسند کیا۔ جبکہ نوجوان مردوں نے دائیں حتیٰ کہ انتہائی دائیں بازو کی جماعتوں کو ووٹ دیا۔

فرانس میں ۲۰۲۲ء میں، نوجوان خواتین کے مقابلے میں نوجوان مرد ایرک زیمور (Eric Zemmour) میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے، جو صدارتی امیدار تھے اور انہوں نے مشہور ترین فیمینسٹ سیمون ڈی بیوور (Simone de Beauvoir) کی تردید میں ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ یونیورسٹی آف کولون کے انزار ہوڈ کے مطابق، جرمنی میں ۲۰۲۱ء کے انتخابات میں، نوجوان خواتین اور نوجوان مردوں کے درمیان دائیں بائیں کا فرق سب سے زیادہ دیکھا گیا۔ پرتگال میں جہاں انتہائی دائیں جانب کی شیگا پارٹی نے ۱۰ مارچ کو انتخابات میں بازی لی، اس کی حمایت نوجوانوں، مردوں اور کم تعلیم یافتہ ووٹروں پر مرکوز ہے۔ اور ۲۰۲۲ء میں جنوبی کوریا میں واضح طور پر ایک اینٹی فیمینسٹ صدر کا انتخاب کیا گیا جنہیں ۲۰ سے ۲۹ سال کی عمر کے ۵۸ فیصد سے زائد مردوں نے ووٹ دیا جبکہ اسی عمر کی تقریباً ۵۸ فیصد خواتین نے ان کے حریف کی حمایت کی۔

مرد اور عورت کے درمیان رویوں کے فرق کا اس سے بھی پتا چلا کہ وہ ایک دوسرے کو کیسے دیکھتے ہیں۔ ۲۷ یورپی ممالک میں لوگوں سے پوچھا گیا کہ کیا وہ اس بات سے متفق ہیں کہ ''خواتین کے حقوق کو فروغ دینے کا معاملہ بہت آگے جا چکا ہے اور اس سے مردوں اور لڑکوں کے آگے بڑھنے کے مواقع کو خطرات لاحق ہیں''۔ اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ خواتین کے مقابلے میں مرد اس سے زیادہ اتفاق کرتے۔ اس میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ عمر رسیدہ مردوں کے مقابلے میں نوجوان مرد زیادہ فیمینسٹ مخالف تھے، یہ صورتحال اس مقبول خیال کے خلاف ہے کہ ہر نسل پچھلی نسل کے مقابلے میں زیادہ لبرل ہوتی ہے۔ گوٹنبرگ یونیورسٹی کے جیوآن آف، نیکولس شارون اور ایمی الیگزنڈر یورپ کے نوجوان مردوں (۱۸ تا ۲۹ سال) اور عمر رسیدہ مردوں (۶۵ سال سے زائد عمر) کے درمیان فرق کو ایک جرمن تشبیہ سے بیان کرتے ہیں۔ اس سوال پر یہ اتنا ہی بڑا فرق ہے جتنا

گیرٹ وائلڈرز کی انتہائی دائیں بازو کی پارٹی فار فریڈم اور لبرل ڈیموکریٹس کے درمیان فرق۔

اس قسم کا پیٹرن دیگر ترقی یافتہ ممالک میں بھی پایا جاتا ہے۔ برطانوی نوجوان مردوں کا بڑا طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ مرد ہونے کے مقابلے میں عورت ہونا زیادہ مشکل ہے لیکن اگر ان کا موازنہ عمر رسیدہ برطانوی مردوں سے کیا جائے تو نوجوان یہ کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں کہ ایک عورت کے مقابلے میں مرد ہونا مشکل تر ہے۔ جنوبی کوریا میں ۲۰ سے ۲۹ سال کی عمر کے لگ بھگ ۸۰ فیصد مردوں نے کہا کہ مردوں کے ساتھ امتیازی سلوک برتا جاتا ہے جبکہ ۶۰ سال سے زیادہ عمر کے بمشکل ۳۰ فیصد مرد ہی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں۔

چین میں سروے کرنے والے لوگوں سے وونگ کا مقصد نہیں پوچھتے، لیکن جب صنفی کردار کی بات آتی ہے تو نوجوان مردوں اور نوجوان عورتوں کے درمیان اسی طرح کا فرق پایا جاتا ہے۔ یونیورسٹی آف کولمبیا کے یو چیان اور شنگھائی یونیورسٹی کے میڈیسن اینڈ ہیلتھ سائنسز کے جیاژنگ نے پینتیس ہزار چینیوں کے سروے ڈیٹا کا جائزہ لیا، اور یہ دیکھا کہ نوجوان خواتین کے مقابلے میں نوجوان مرد اس بات سے زیادہ متفق تھے کہ ''مردوں کو اپنے کیریئر کو ترجیح دینی چاہیے جبکہ خواتین کو اپنے گھر پر توجہ دینی چاہیے'' اور ''جب معیشت خراب ہو تو خواتین ملازمین کو پہلے ملازمت سے نکالنا چاہیے''۔ نوجوان چینی مردوں کے خیالات عمر رسیدہ مردوں سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔ جبکہ نوجوان خواتین کے خیالات ان کی ماؤں کے مقابلے میں کہیں زیادہ 'مساوات پسند' تھے۔ بیجنگ میں مارکیٹ ریسرچ کرنے والی کلیری (جو اپنی شناخت چھپانے کے لیے انگریزی نام استعمال کرتی ہے) نے کہا کہ وہ ایک ایسا ساتھی چاہتی ہے جو اس کے ساتھ برابری کا سلوک کرے اور گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹائے۔ ''میرا خیال ہے کہ چینی مرد اس ٹیسٹ میں فیل ہو جائیں گے''۔ اس نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر چیان کا کہنا ہے کہ جب چینی والدین رشتے کی تلاش میں پارکوں میں جاتے ہیں تو وہ اپنے بیٹوں کی ملازمت اور ڈگری کی بات تو کرتے ہیں لیکن اپنی بیٹیوں کی کامیابیاں چھپاتے ہیں۔ انہیں ڈر ہوتا ہے کہ اس طرح ان کا متوقع رشتہ چھوٹ نہ جائے۔

آخر یہ سب کیا ہے؟ اس بڑھتی ہوئی تقسیم کے سب سے زیادہ ممکنہ اسباب تعلیم (نوجوان مرد، نوجوان خواتین سے کم تعلیم حاصل کر رہے ہیں)، تجربہ (ترقی یافتہ ممالک کمتر صنف افروز ہو گئے ہیں اور مردوں عورتوں کا یہ تجربہ مختلف ہے)، اور ایکو چیمبرز (سوشل میڈیا پولرائزیشن کو بڑھا رہا ہے) ہیں۔ نیز، جمہوری ممالک میں دائیں بازو کے بہت سے سیاست دان نوجوان مردوں کی شکایات کو بڑی مہارت سے حل کر رہے ہیں، جبکہ بائیں بازو کے بہت سے لوگ مشکل سے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ نوجوانوں کو حقیقی مسائل درپیش ہیں۔

لیکن مسائل موجود ہیں اور ان میں پہلی چیز تعلیم ہے۔ اگرچہ بڑے عہدوں پر موجود مرد اچھا کام کر رہے ہیں، لیکن باقی پُرمشقت زندگی گزار رہے ہیں۔ ایک سروے کے مطابق امیر ملکوں میں ۲۸ فیصد لڑکے کم از کم خواندگی کی شرح تک پہنچنے میں بھی ناکام رہتے ہیں جو ہائی اسکول کے طلبہ کے ٹیسٹ کا معیار ہے، لڑکیوں میں یہ تعداد صرف ۱۸ فیصد ہے۔ یورپ میں ۲۰۰۲ء اور ۲۰۲۰ء کے درمیان گریجویشن کی ڈگری رکھنے والے ۲۵ سے ۳۴ سال کی عمر کے مردوں کی تعداد ۲۱ فیصد سے بڑھ کر ۳۵ فیصد ہو گئی جبکہ خواتین کی تعداد ۵۲ فیصد سے بڑھ کر ۶۴ فیصد ہو گئی۔ امریکا میں بھی یہ فرق تقریباً اتنا ہی ہے۔

تعلیم میں فرق سے رویے میں فرق جنم لیتا ہے۔ جو لوگ کالج کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان میں لبرل فکر کو قبول کرنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ یہ تعلیمی خلا اس بات کا سبب بھی بنتا ہے کہ مرد اور خواتین کیسے زندگی، کام اور رومانس کا تجربہ کرتے ہیں۔ سادہ الفاظ میں، ایک امیر ملک میں جب ایک خاتون یونیورسٹی چھوڑتی ہے تو وہ وائٹ کالر ملازمت تلاش کرتی ہے تاکہ اپنی گزر اوقات خود کرنے کے قابل ہو سکے۔ لیکن جب وہ اپنی زندگی کے ساتھی کی تلاش کے لیے نکلتی ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ یہاں تو مردوں کے مقابلے میں گریجویٹ خواتین کی تعداد بہت زیادہ ہے اور لبرل اور تعلیم یافتہ مردوں کی تعداد طلب سے کم ہے۔ شیرل لیوس جو واشنگٹن میں ۲۶ سالہ ہیلتھ کیئر ورکر ہیں، یہ شکایت کرتی ہیں کہ ''اس کی عمر کے مرد چھوٹے بچوں والا ذہن رکھتے ہیں۔''

ساتھی کی تلاش یونیورسٹی نہ جانے والے لڑکوں کے لیے بھی مختلف حالات پیش کر سکتی ہے اور خواتین انہیں مسترد کر سکتی ہیں۔ میشال پازورا جو پولینڈ سے تعلق رکھنے والے نوجوان ڈیری فارمر ہیں، ان کا کہنا ہے ''میں روایت پسند اور یکساں لائف اسٹائل رکھتا ہوں۔ مرد کسانوں کے لیے اپنی شریکِ حیات تلاش کرنا بہت ہی مشکل ہے، اسی وجہ سے پولش ٹیلی ویژن کا ریئلیٹی شو ''کسان کو ایک بیوی چاہیے'' وہاں کے مقبول ترین ٹیلی ویژن پروگراموں میں سے ہے۔ ایک پولش کسان لوکاز کا کہنا ہے ''یہ بتانا مشکل ہے کہ آج عورت ایک مرد میں کیا چاہتی ہے۔'' وہ یاد کرتے ہیں، ''پہلے عورت کی خواہش بس اتنی ہوتی تھی کہ اس کے مرد کی آمدن مستحکم ہو، وہ گھر میں چیزیں ٹھیک کر سکتا ہو اور اس کے پاس ڈرائیونگ لائسنس ہو۔''

رویوں میں خلیج کیا اس بات پر اثر انداز ہو گی کہ آج کے کتنے نوجوان آخر کار جوڑے بنتے اور بچے پیدا کرتے ہیں۔ یہ جاننا بہت قبل از وقت ہے۔ لیکن جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امیر دنیا کی گرتی ہوئی شرح پیدائش ایک مسئلہ ہے، ان کے لیے یہ ابتدائی علامات حوصلہ شکن ہیں۔ امریکا میں ڈینیل کوکس، کیلسی آئیر ہیمنڈ اور کائل گرے جو امریکی زندگی سے متعلق ایک سروے سینٹر سے تعلق رکھتے ہیں، انہوں نے یہ دیکھا کہ جنریشن زیڈ (وہ افراد جو ۹۰ کی دہائی کے آخر یا ۲۰۰۰ء کی دہائی کی ابتدا میں پیدا ہوئے) نے اپنا پہلا رومانی رشتہ ملینیلز (جو افراد ۱۹۸۰ء کے عشرے سے ۱۹۹۰ء کے آخر تک پیدا ہوئے) یا جنریشن ایکس (جو افراد ۱۹۸۰ء سے پہلے کے عشرے میں پیدا ہوئے) کے مقابلے میں بہت تاخیر سے قائم کیا اور وہ خود کو کہیں زیادہ تنہا محسوس کرتے ہیں۔

جنریشن زیڈ کی خواتین بھی عمر رسیدہ خواتین کے مقابلے میں حیران کن طور پر خود کو اپنے ساتھی مردوں سے زیادہ lgbt یعنی ہم جنس پرست کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ یہ چیز قابل غور ہے کہ کیا یہ عدم توازن باقی رہے گا اور اگر ایسا ہوا تو اس سے مستقبل میں خاندانوں کی تشکیل پر کیا اثرات پڑیں گے۔

فیمنزم کے خلاف ردعمل خاص طور پر نوجوان مردوں میں تگڑا ہو سکتا ہے کیونکہ وہ خواتین کی ترقی سے بہت زیادہ خوفزدہ ہیں۔ خواتین کے لیے اچھی ملازمتوں کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مردوں کے لیے منفی چیز ہے، لیکن بہت سے مرد ایسا سمجھتے ہیں۔ عمر رسیدہ مرد زیادہ فکر مند نہیں ہوتے، کیونکہ وہ اپنے کیریئر میں مستحکم ہو چکے ہوتے ہیں یا پھر ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر آف، ڈاکٹر شیرون اور ڈاکٹر الیگزنڈر کا کہنا ہے کہ اس کے برعکس، نوجوان مردوں نے تو ابھی زندگی شروع کی ہے ''لہٰذا وہ خواتین کے مقابلے کو مستقبل میں اپنے لیے زیادہ بڑا خطرہ سمجھتے ہیں''۔ ان محققین نے تجزیہ کیا ہے کہ نوجوان یورپی مردوں میں خواتین سے نالاں ہونے کا امکان کہیں زیادہ ہے (اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ فیمنزم حد سے آگے بڑھ چکا ہے) خاص طور پر اگر ان نوجوانوں کے علاقے میں بے روزگاری بڑھ گئی ہو اور وہ اپنے معاشرے کے اداروں کو غیر منصفانہ سمجھتے ہوں تو ایسا زیادہ ہو گا۔ وہ مزید کہتے

ہیں کہ فیمنسٹ مخالف خیالات دائیں بازو کے آمرانہ نظریات کی صحیح صحیح پیش گوئی کرتے ہیں۔

مردوں کی تمام شکایات بے جا نہیں ہیں۔ بعض ممالک میں، عدالتیں طلاق یا خلع کے کیسوں میں بچے کی حوالگی کے لیے ماں کے حق میں فیصلہ دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ پنشن کے قوانین بھی خواتین کو زیادہ مراعات دیتے ہیں۔ لیکن امیر ممالک میں خواتین کے لیے ریٹائرمنٹ کی حدِ عمر اوسطاً کچھ کم ہے۔ پولینڈ میں یہ مردوں سے پانچ سال کم ہے۔ چنانچہ ایک پولش مرد کو اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد والی زندگی کے دورانیے سے تین گنا زیادہ برسوں تک کام کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ پولش خواتین کو صرف ۴ء۱ گنا زیادہ برسوں تک ہی کام کرنا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے بہت سے مرد اسے غیر منصفانہ کہتے ہیں۔

نوجوان مردوں کو متاثر کرنے والا ایک اور عامل فوج میں بھرتی کا قانون ہے۔ انہیں بھرتی کے لیے پہلے بلایا جاتا ہے اور خواتین کو اکثر بلایا جاتا ہے۔ جنوبی کوریا میں، جہاں فوجی خدمات مردوں کے لیے ضروری ہیں، یہ مردوں کے غصے کو ہوا دیتی ہے۔ یورپ میں بھرتی اب عام نہیں رہی، لیکن روس کے یوکرین پر حملہ کرنے کے بعد پڑوسی ممالک (مثلاً پولینڈ) کے نوجوان مرد اس بات سے کہیں زیادہ خوفزدہ ہیں کہ انہیں فوج میں بھرتی کے لیے بلا لیا جائے گا۔

سوشل میڈیا وہ عدسہ ہے جس کی مدد سے دنیا کو دیکھتے ہیں، یہاں ان کی پولرائزیشن (شدت پسندی) بڑھ سکتی ہے۔ سوشل میڈیا سے لوگ ایکو چیمبر بناتے ہیں۔ جب ایک جیسی سوچ رکھنے والے گروپ ایک معاملے پر بات کرتے ہیں تو وہ مزید شدت پسند ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ افراد گروپ کے بنیادی موقف کو مزید قوی الفاظ میں بیان کرتے اور اس پر اختلاف کرنے والوں پر چوٹ کرتے ہیں۔

جب مضطرب اور غصیلے نوجوان مردوں کے یہ گروپ ایک ساتھ ہوتے ہیں تو بات چیت اکثر عورت دشمنی پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ مردوں کے چینی چیٹ رومز میں لفظ feminist whore (یعنی فیمینسٹ طوائف) عام ہے اور ساتھ ہی ایسی علامات استعمال کی جاتی ہیں جن سے یہ غصہ مزید بڑھے۔

جب ایک مرد اس قسم کے غصیلے آن لائن گروپ میں شامل ہوتا ہے تو اس پر اس میں شامل رہنے کا دباؤ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ بنجمن نامی ایک طالب علم جو واشنگٹن ڈی سی میں رہتا ہے ''ریڈ پل گائے'' ہے، وہ میک ڈونلڈ کھاتا ہے اور خود ترسی کا شکار ہے، اس نے لڑکیوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے اپنی خود اعتمادی میں اضافے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے آن لائن کلاسیں لینا شروع کیں۔ جب اس نے مردوں کا یہ گروپ (manosphere) چھوڑا تو اس کے دوستوں نے اسے ''بلیو پل'' (ایسا فرد جسے حکومت نے بے وقوف بنایا ہو) کہہ کر اس پر طعن و تشنیع شروع کر دی۔

دوسری بات یہ کہ سوشل میڈیا کا الگورتھم صارفین کو ایسے مواد سے جوڑتا ہے جو انہیں خوفزدہ یا مشتعل کر دے اور انہیں دنیا حقیقت سے کہیں زیادہ بھیانک اور غیر منصفانہ نظر دکھائی دینے لگے۔ جو خواتین #MeToo کے قصوں پر کلک کرتی ہیں، انہیں مزید ویسے قصے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح مرد ایسے قصوں پر کلک کرتے ہیں جن میں مردوں پر زنا کا جھوٹا الزام لگایا جاتا ہے۔ گویا ہر ایک کو ویسے ہی خطرات کے مبالغہ انگیز خیالات مل سکتے ہیں جن کا وہ ذاتی طور پر سامنا کرتے ہیں۔

اٹلانٹا میں رہنے والا اٹھائیس سالہ کنزرویٹو خلیل روز کہتا ہے کہ ''جب آپ جم میں ورزش کرنے جاتے ہیں اور وہاں اپنے سامنے ایک خاتون کو ورزش کرتا دیکھ لیں تو آناً فاناً ٹک ٹاک پر مشہور ہو جاتے ہیں کہ اس مرد نے اس خاتون کو جنسی طور پر ہراساں کیا ہے، وغیرہ وغیرہ''۔ اس کے ہر جاننے والے کے ساتھ تو ایسا نہیں ہوا، لیکن فون پر اس نے ایسے واقعات دیکھے ہیں اور یہ چیز اس کے حواس پر سوار ہو گئی ہے۔ واشنگٹن میں رہنے والا ایک طالب علم بنجمن بھی ایسا ہی ایک مایوس کن پس منظر پیش کرتا ہے: ''میری عمر کے مرد شادی کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کیونکہ انہیں دھڑکا لگا رہتا ہے کہ خواتین بے وفائی کرتی ہیں، خلع کے لیے عدالت چلی جاتی ہیں اور مردوں کی دولت ہتھیا لیتی ہیں''۔

خواتین آن لائن ایک مختلف دنیا دیکھتی ہیں۔ جولیا کوزک جو وارسا سے تعلق رکھنے والی طالبہ ہیں، ٹک ٹاک پر ایک ٹپ کو فالو کرتی ہیں۔ جب وہ ٹیکسی میں سوار ہوتی ہیں، تو وہ اپنے بال کا ایک گلڑا نکال کر سیٹ کے نیچے رکھ دیتی ہیں، تاکہ اگر انہیں اغوا کر لیا جائے اور پولیس کو ڈی این اے ثبوت کی ضرورت پڑے تو ان کا بال وہاں موجود ہو۔ وہ کہتی ہیں، ''میں اکثر ہر حالت میں مردوں سے گریز کرتی ہوں''۔

بائیں بازو کی سیاست نے خواتین کو اس حوالے سے مائل کرنے کے لیے موثر کام کیا ہے کہ وہ ان کے مسائل پر توجہ دیتی ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھاتی کہ مردوں سے کیسے بات کرنی ہے۔ ''لڑکوں اور مردوں کے بارے میں'' (Of Boys and Men) کے مصنف اور لبرل اسکالر رچرڈ ریوز دلیل دیتے ہیں کہ ''ترقی پسند (پروگریسو) اکثر یہ فرض کرتے ہیں کہ 'صنفی عدم مساوات صرف ایک ہی طریقے سے چل سکتی ہے، یعنی خواتین کو نقصان پہنچا کر۔' اور پھر وہ اس پر ''زہریلی مردانگی'' جیسے آوازے لگاتے ہیں جس سے اندھا دھند یہ اشارہ ملے کہ مرد ہونا بذاتِ خود غلط ہے۔ نابالغ لڑکوں اور مردوں کو ان کے طرزِ عمل کے بارے میں مکالمے میں شامل کرنے سے الٹا ایک نقصان ہی ہوگا کہ وہ آن لائن manosphere گروپوں میں جائیں گے جہاں انہیں یہ یقین دلایا جائے گا انہوں نے کچھ غلط نہیں کیا۔'

اس کے برعکس، دائیں بازو کے چند سیاست دانوں نے نالاں مردوں سے رابطہ کرنے کے طریقے تلاش کیے ہیں۔ ڈونلڈ ٹرمپ اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ سروے سنٹر آن امریکن لائف کے مسٹر کوکس کہتے ہیں ''وہ (ڈونلڈ ٹرمپ) 'جواں مردی اور مردانگی کا امیج' بڑھا رہے ہیں۔ انہوں نے الٹیمیٹ فائٹنگ چیمپئن شپ ایونٹ میں شرکت کر کے خبروں کو اہمیت نہ دینے والے مردوں کو اپنا ہدف بنایا۔ وہ ''ثقافتی تنازعات میں مردوں کا ساتھ دینے'' کا بھی رجحان رکھتے ہیں۔ ۲۰۱۸ء میں انہوں نے ریپ اور جنسی استحصال کے معاملات میں ثبوت کا بوجھ مردوں پر ڈالنے کی مذمت کی تھی، انہوں نے کہا تھا کہ ''یہ امریکا میں نوجوان مردوں کے لیے ایک بہت ہی خوفناک وقت ہے کہ آپ کسی ایسی چیز کے مجرم ٹھہرائے جائیں جو آپ نے کیا ہی جس کے آپ مجرم نہیں ہو سکتے۔۔۔ یہ بہت برا ہے جو عین اس وقت ہو رہا ہے''۔

جو کام دونوں فریقوں نے نہیں کیا وہ ان بنیادی مسائل سے نمٹنا ہے جو نوجوان مردوں اور نوجوان خواتین کے درمیان خلیج پیدا کر رہے ہیں۔ سب سے اہم یہ کہ پالیسی سازوں کو اس بارے میں سوچنا چاہیے کہ کم کارکردگی دکھانے والے لڑکوں کے لیے اسکول کیا کریں۔ مسٹر ریوز کی تجویز یہ ہے کہ زیادہ مرد اساتذہ رکھے جائیں، اور لڑکوں کو ایک سال بعد اسکول میں داخل کیا جائے، کیونکہ فطری طور پر لڑکے لڑکیوں کے مقابلے میں کمتر رفتار سے مچیور ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ، ریاست پیشہ ورانہ تربیت میں اضافہ کر سکتی ہے تاکہ نوجوان مردوں کو ان پیشوں کے لیے تیار کیا جا سکے جن سے وہ فی الوقت دُور ہیں، جیسے صحت، تعلیم یا انتظامی امور۔ اگر اس قسم کی اصلاحات سے لڑکوں اور مردوں کو بدلتی دنیا میں مدد مل سکتی ہے تو ان سے مردوں اور عورتوں، دونوں کو فائدہ ہوگا۔

(ترجمہ: سید عرفان احمد)

"Why young men and women are drifting apart". ("The Economist". March 13, 2024)

سُوپر چیٹ: یُوٹیوبر نَفرت پھیلا کر کما رہے ہیں

وپل کمار

یوٹیوب کا سوپر چیٹ فیچر پیسہ کمانے کے لیے عام شہریوں کو اشتعال انگیز مواد کی جانب راغب کر رہا ہے۔ سوپر چیٹ سے پیدا ہونے والی شدت پسندی پر قابو پانے میں یوٹیوب نہ صرف ناکام رہا ہے، بلکہ اس سے منافع بھی کما رہا ہے۔

اب یہ واضح ہوگیا ہے کہ یوٹیوب اپنے پلیٹ فارم پر نشر ہونے والی ہر طرح کی شدت پسندی، نفرت انگیز اور سماج دشمن عناصر سے لاتعلق بنا ہوا ہے۔ یوٹیوب کا مرکزی پلیٹ فارم ہی نہیں بلکہ اس کے معاون ٹول بھی نفرت پھیلانے میں اور اس کے ذریعے منافع کمانے میں مدد کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک ٹول ہے سوپر چیٹ۔

چار ماہ قبل دائیں بازو کے یوٹیوب کریئیٹر اجیت بھارتی نے یوٹیوب پر ایک ویڈیو لائیو نشر کیا تھا۔ اس ویڈیو میں وہ کہتے ہیں کہ مسلمان منصوبہ بند طریقے سے ہندو لڑکیوں کے خلاف 'لو جہاد' کر رہے ہیں۔ اسی لائیو کے دوران 'سوپر چیٹ' کے ذریعے کمار سوربھ نامی شخص نے پوچھا، 'کیا ہم لو جہاد کے خلاف رنویر سینا جیسا کوئی دستہ بنا سکتے ہیں؟'

معلوم ہو کہ بہار میں دلت کمیونٹی کے قتل عام کا ملزم رنویر سینا دستہ اپنی بداعمالیوں کے لیے معروف ہے۔ اجیت بھارتی ایسے دستے کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں۔

اجیت اس ویڈیو میں کرناٹک کے جس واقعہ کو 'لو جہاد' بتا رہے ہیں، اس معاملے میں ریاستی پولیس، وزیر اعلیٰ اور بعد میں سی آئی ڈی نے بھی اپنی چارج شیٹ میں فرقہ وارانہ زاویہ یا مبینہ لو جہاد سے انکار کیا تھا۔

اجیت بھارتی کا یہ لائیو ویڈیو، جسے ایک لاکھ سات ہزار بار دیکھا گیا، یوٹیوب کے فیک نیوز، پرتشدد اور مہلک مواد سے متعلق تمام گائیڈ لائنس کے خلاف ہے۔ اس ویڈیو پر آیا کمار سوربھ کا سوپر چیٹ بھی اس کی ایک مثال ہے۔

منافع بخش سودا

مسلمانوں کے خلاف تشدد پر اُکسانے والی یہ سوپر چیٹ کمار سوربھ نے ۴۰ روپے دے کر خریدی تھی، جس میں سے ۷۰ فیصد (۲۸ روپے) کریئیٹر اجیت بھارتی کو ملے گا اور ۳۰ فیصد (۱۲ روپے) یوٹیوب اپنے پاس رکھے گا۔ یوں سوپر چیٹ انتہائی منافع بخش سودا ہے۔

اجیت بھارتی کو اس لائیو ویڈیو پر آئے سوپر چیٹ سے تقریباً ۲۱۰۰ روپے کی آمدنی ہوئی، جبکہ نفرت انگیز اور پرتشدد مواد سے متعلق رہنما اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک اور ویڈیو پر آئے سوپر چیٹ سے انہیں چودہ ہزار روپے تک کی آمدنی ہوئی۔

اجیت بھارتی دائیں بازو کا ایک جانا پہچانا نام ہے۔ جہاں یوٹیوب پر ان کے ۶ لاکھ ۳۹ ہزار سبسکرائبر ہیں، وہیں ایکس پر ۴ لاکھ ۴۷ ہزار اور انسٹاگرام پر ۲ لاکھ ۶۴ ہزار فالوور ہیں۔ وہ اوپ انڈیا نامی ویب سائٹ کے مدیر رہ چکے ہیں۔

اجیت بھارتی اکیلے نہیں ہیں جو یوٹیوب پر اور یوٹیوب کے ساتھ مل کر نفرت کا کاروبار کر رہے ہیں۔ سدرشن ٹی وی نیوز چینل بھی اسی ذیل میں آتا ہے، جو اپنے ویڈیوز میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلاتا ہے۔ اس کے باوجود یوٹیوب ان کے چینل کو نہیں ہٹاتا۔ انہیں پیسہ بھی کمانے دیتا ہے اور اس مواد سے خود بھی منافع کماتا ہے۔

سدرشن چینل کے نفرت سے بھرے ویڈیو کے ساتھ گو آئی بی بو اور زومیٹو جیسے بڑے برانڈز کے اشتہار آتے ہیں، جن کے لیے یوٹیوب ان کمپنیوں سے موٹی رقم وصول کرتا ہے اور اس کا کچھ حصہ کریئیٹر کے ساتھ بھی شیئر کرتا ہے۔

یوٹیوب کے سی ای او نیل موہن کا کہنا ہے کہ کریئیٹر کے ساتھ اس طرح کی شراکت 'کاروبار کے لیے سودمند ہے۔'

یوٹیوب کا بزنس ماڈل

جنوری ۲۰۱۷ء میں یوٹیوب نے سوپر چیٹ اور سوپر اسٹیکرز لانچ کیے تھے۔ اس کے ذریعے کوئی بھی صارف ایک مخصوص رقم ادا کر کے اپنے تبصرے یا اینیمیٹڈ اسٹیکرز کو بڑے سائز اور مختلف رنگوں میں دکھا سکتا ہے۔ سوپر چیٹ یا سوپر اسٹیکر میں الفاظ ور لائیو چیٹ میں یہ کتنی دیر تک نظر آئے گا، اس کا انحصار اس رقم پر ہے جس کے لیے اسے خریدا گیا ہے۔

ہندوستان میں سوپر چیٹ کی قیمت ۴۰ روپے سے لے کر ۱۰ ہزار روپے تک ہے۔ یہ قیمت یوٹیوب کی طرف سے طے کی جاتی ہے اور اس کا تعین چیٹ کی مدت اور الفاظ سے کیا جاتا ہے۔

سوپر اسٹیکرز ۱۹ روپے سے ۱۰۰۰ روپے تک کی قیمتوں میں دستیاب ہیں۔ اس رقم کی ادائیگی کر کے آپ کمنٹ سیکشن میں اینیمیٹڈ اسٹیکرز پوسٹ کر سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر، ۱۹ روپے کا اسٹیکر صرف رنگ اور سائز بدلتا ہے، ۱۰۰۰ روپے کا اسٹیکر اینیمیشن بھی دیتا ہے اور لائیو ویڈیو پر ۳۰ منٹ تک نظر آتا ہے۔

یوٹیوب کے ضابطے کے مطابق، یوٹیوب پر کسی بھی مواد کو ظاہر کرنے کے لیے کمیونٹی گائیڈ لائن پر عمل کرنا ضروری ہے۔ یوٹیوب کا کہنا ہے کہ اگر کوئی سوپر چیٹ کے رہنما اصولوں کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے حذف کر دیا جائے گا اور رقم 'عطیہ' کر دی جائے گی۔ تاہم اس حوالے سے کوئی شفافیت نہیں ہے کہ یہ کس قسم کا عطیہ ہوگا۔

کمار سوربھ کا تبصرہ یوٹیوب کے رہنما خطوط کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ 'دی وائر' نے یوٹیوب پر کمار سوربھ کے تبصرے کو دو بار رپورٹ کیا، لیکن اسے آج تک ہٹایا نہیں گیا ہے۔

سوپر چیٹ ایک عام شہری کو مشہور شخصیات سے براہ راست رابطہ کرنے اور عوامی سطح پر نوٹس کیے جانے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔ وہ مشہور شخصیت کی توجہ مبذول کرنے کے لیے اشتعال انگیز باتیں کہہ سکتا ہے اور پیسے کی چاہت میں سلیبریٹی بھی اشتعال انگیز باتیں کر سکتا ہے تاکہ ناظرین بات چیت میں زیادہ شامل ہوں۔ اس لیے ضروری ہے کہ یوٹیوب اس بات کو یقینی بنائے کہ فوری پیسہ کمانے کے اس ذرائع پر رہنما اصولوں پر عمل کیا جائے۔

قوانین کی کھلی خلاف ورزی

قواعد کی عدم تعمیل کی صورت میں سوپر چیٹ مذہبی، ذات پات اور صنفی مسائل پر ماحول کو بھڑکانے کا ایک ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال اجیت بھارتی کا لائیو ویڈیو ہے۔

'اس قاتلانہ ذہنیت کا حل کیا ہے؟ یہ تو ہوتا رہے گا۔ کیسے اور کب رکے گا؟' مسلمانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امیت مشرا نامی ناظر کی جانب سے آیا ۱۰۰ روپے کا سوپر چیٹ ویڈیو میں نظر آتا ہے اور باقی کمنٹ سے مختلف رنگ اور سائز میں بڑا نظر آتا ہے۔

اس کے جواب میں اجیت بھارتی مدرسوں میں پڑھنے والے مسلمان بچوں کو جنسی مجرم قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، 'نہیں رکے گا امیت جی، یہ نہیں رکے گا۔ یہ کوئی واحد واقعہ نہیں ہے۔۔۔ مراد آباد کا ایک مدرسہ تھا، اس کا ایک بچہ پکڑ میں آیا تھا۔۔۔ چھوٹا سا بچہ تھا، ۷۔۸ سال کا اور کچھ کر رہا تھا ہندو لڑکی کے ساتھ۔ کوئی پوچھا کیا کر رہے ہو تو بولا کہ مولوی جی یہی سکھاتے ہیں۔ بولتے ہیں ہندو لڑکی ہے تو اس کو پکڑ کر لایا

کرواوراس کے ساتھ گندہ کام کرو۔'

اس کے بعد اجیت بھارتی مسلمان مردوں کو پرتشدد اور مدارس کو خطرناک بتاتے ہیں۔ اگلا سوپر چیٹ تقریباً ۳۰۰ روپے کا ہے جو چینی صدر شی جن پنگ کو صحیح ٹھہراتا ہے۔

جواب میں اجیت بھارتی بھی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور 'شدت پسندی' کو ختم کرنے کے لیے جن پنگ کے راستے کو صحیح بتاتے ہیں۔ غور طلب ہے کہ چین کی طرف سے مسلمانوں کے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے متعدد شواہد موجود ہیں۔

رائٹرز انسٹی ٹیوٹ کی اس سال کی ایک تحقیق کے مطابق، ہندوستان میں تقریباً ۵۰ فیصد لوگوں کے لیے خبروں کا ذریعہ سوشل میڈیا ہے اور ان میں سے ۵۴ فیصد کا انحصار صرف یوٹیوب پر ہے۔ ایسی صورت حال میں یوٹیوب کی جانب سے قوانین پر عمل کرنے کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔

کئی ریسرچ کے مطابق، یوٹیوب اپنے پلیٹ فارم پر ویڈیو مواد کے لیے اس بات کو یقینی نہیں بنا پاتا کہ وہ اس کے کمیونٹی گائیڈ لائن پر عمل کرے۔ ایک ویڈیو پر سیکڑوں سوپر چیٹ نمودار ہو سکتے ہیں۔ جب یوٹیوب ویڈیو پر قواعد کو نافذ کرنے سے قاصر ہے، تو اس بات کا امکان کم ہے کہ وہ تبصروں کو نظم وضبط میں لے سکے گا۔

ایک رپورٹ کے مطابق 'سدرشن نیوز' کے یوٹیوب چینل پر تقریباً ۲۵ ویڈیو گائیڈ لائن کی خلاف ورزی کر رہے تھے، انہیں یوٹیوب کو رپورٹ کیا گیا۔ لیکن یوٹیوب نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ ان میں سے بہت سے ویڈیوز گزشتہ لوک سبھا انتخابات کے دوران بنائے گئے تھے اور یہ مسلم کمیونٹی کے خلاف نفرت اور فرضی حقائق پر مبنی تھے۔ ان تمام ویڈیو کے مجموعی طور پر تقریباً ۳۵ لاکھ ویوز ہیں۔

یوٹیوب کی ٹرانسپیرنسی (شفافیت) رپورٹ کے مطابق، یوٹیوب کے رہنما اصولوں کی خلاف ورزی کرنے والے سب سے زیادہ ویڈیوز بھارت سے اپلوڈ کیے جاتے ہیں۔ جنوری ۲۰۲۴ء سے مارچ ۲۰۲۴ء کے درمیان صرف بھارت سے ۲۶ لاکھ سے زیادہ ویڈیو ہٹائے گئے ہیں۔ یوٹیوب ان ویڈیوز کو ہٹانے سے متعلق ملک وار سہ ماہی ڈیٹا شائع کرتا ہے جو اس کے رہنما خطوط کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ بھارت پچھلے چار سالوں سے اس درجہ بندی میں پہلے نمبر پر ہے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسکالرز کی تحقیق کے مطابق، یوٹیوب اور دیگر سوشل میڈیا پلیٹ فارم غریب ممالک سے آنے والے نفرت انگیز تقاریر، پروپیگنڈے اور پرتشدد مواد کو نظر انداز کرتے ہیں لیکن ترقی یافتہ ممالک میں ان قوانین پر زیادہ سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔

گزشتہ سال ہریانہ میں ایک مبینہ گئو رکشک مونو مانیسر پر دو مسلمانوں کو اغوا کرنے اور انہیں زندہ جلا کر قتل کرنے کا الزام تھا۔ مونو ایک یوٹیوب کریئیٹر بھی تھا جو تقریباً ۶ سال تک یوٹیوب پر پُرتشدد ویڈیوز پوسٹ کر رہا تھا۔ اپنے ویڈیو میں وہ مویشی لے جانے والی گاڑیوں کا پیچھا کرتا تھا اور ان پر گولیاں بھی چلاتا تھا۔ کئی ویڈیوز میں یہ بھی دیکھا گیا کہ بچ کر بھاگنے والی گاڑیاں حادثے کا شکار ہو جاتی تھیں۔ وہ بچ کر فرار ہونے والے لوگوں کو قیدی بنا لیتا تھا اور ان زخمی افراد کے ساتھ تصویریں کھنچواتا تھا۔

یوٹیوب پر اس کے تقریباً ۲ لاکھ سبسکرائبر تھے اور یوٹیوب نے مونو کے ایک چینل پر ایک لاکھ سبسکرائبر ہونے پر اسے سلور بٹن سے بھی نوازا تھا۔ اس کے چینل کو کئی ہندوستانی نیوز اور فیکٹ چیک کرنے والے پلیٹ فارم کی رپورٹنگ کے باوجود نہیں ہٹایا گیا۔ جبکہ فروری ۲۰۲۳ء میں نیویارک میں قائم نیوز آرگنائزیشن کوڈ اسٹوری کی رپورٹنگ کے بعد یوٹیوب نے مونو کے چینل سے نو ویڈیو ہٹا دیے تھے۔

یوٹیوب کی شفافیت کی رپورٹ کے مطابق، جنوری ۲۰۲۴ء سے مارچ ۲۰۲۴ء کے درمیان یوٹیوب نے دنیا بھر میں گائیڈ لائن کی خلاف ورزیوں کے لیے ۱۴۴ کروڑ سے زیادہ تبصرے ہٹائے۔ یوٹیوب کا دعویٰ ہے کہ اس نے خود ان تبصروں میں سے ۹۹ فیصد کی شناخت کی اور اس کو ہٹایا۔ ان میں سے ۸۳ء۹ فیصد تبصرے، دھوکا دہی یا گمراہ کن ہیں، وہیں نفرت سے بھرے اور توہین آمیز تبصرے صرف ۷ء۱ فیصد ہیں۔

اس رپورٹر نے اجیت بھارتی کے ویڈیو پر نفرت انگیز تبصروں کو یوٹیوب کو رپورٹ کیا، لیکن انہیں ہٹایا نہیں گیا۔ یعنی یوٹیوب نفرت انگیز تبصروں کا نہ تو خود پتا لگاتا ہے اور نہ ہی انہیں رپورٹ کرنے کے بعد ہٹاتا ہے۔ اس کی وجہ یوٹیوب کی تکنیکی نااہلی ہو سکتی ہیں یا یہ کہ نفرت انگیز مواد کا ماڈریشن یوٹیوب کی ترجیح میں نہیں ہے۔ تیسرا امکان یہ ہے کہ نفرت اور پولرائزیشن یوٹیوب کے لیے منافع بخش ہے۔

سوپر چیٹ کے حوالے سے شفافیت کا فقدان یوٹیوب کی پالیسیوں میں ایک بڑی خامی ہے۔ یوٹیوب کی شفافیت کی رپورٹ میں بھی اس بارے میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ یوٹیوب اس بات کا ڈیٹا فراہم نہیں کرتا ہے کہ اس نے گائیڈ لائن کی خلاف ورزی کرنے پر کتنے سوپر چیٹ کو ہٹایا ہے اور اس کی قیمت کتنی تھی؟

ہم نے اجیت بھارتی کے لائیو اور سوپر چیٹ کے حوالے سے یوٹیوب کو کئی سوال بھیجے، لیکن انہوں نے کسی بھی سوال کا جواب نہیں دیا۔ نہ تو اجیت بھارتی کے ویڈیو پر کوئی کارروائی کی گئی اور نہ ہی کمار سوربھ کی 'لو جہاد' سوپر چیٹ پر۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اس کا جائزہ لے رہے ہیں۔

یوٹیوب نے مزید کہا، 'سوپر چیٹ کریئیٹر اپنے چینل کو کمرشلائز کر سکتے ہیں۔ ہم نے متعدد ٹولز بنائے ہیں جو کریئیٹر کو اپنے لائیو ویڈیو میں لائیو چیٹ کو کنٹرول کر سکتا ہے۔ کوئی بھی عام صارف بھی چاہے تو کسی قابل اعتراض سوپر چیٹ کو فلیگ کر سکتا ہے، یعنی یوٹیوب پر رپورٹنگ آپشن کے ذریعے وہ بتا سکتا ہے کہ یہ سوپر چیٹ نامناسب ہے۔'

اس کا مطلب ہے کہ یوٹیوب ساری ذمہ داری کریئیٹر اور ناظرین پر ڈال دیتا ہے۔ اپنے احتساب کے حوالے سے یوٹیوب کا کہنا ہے کہ اگر اس کا اسمارٹ ڈیٹیکشن سسٹم کسی بھی نامناسب سوپر چیٹ کو نشان زد کرتا ہے تو یوٹیوب اس کی خریداری مکمل ہونے سے پہلے ہی روک دیتا ہے۔

لیکن ہماری جانب سے رپورٹ کیے گئے پرتشدد اور نفرت انگیز سوپر چیٹ کو یوٹیوب نہ صرف نشان زد کرنے میں ناکام رہا، بلکہ رپورٹ کرنے کے بعد بھی انہیں ہٹایا نہیں۔

'دی وائر' نے اجیت بھارتی کو بھی سوال بھیجے ہیں، لیکن رپورٹ کی اشاعت تک ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا ہے۔ اگر وہ جواب دیتے ہیں تو اسے رپورٹ میں شامل کیا جائے گا۔

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔ ۷ نومبر ۲۰۲۴ء)

بقیہ: یورپ کس طرف جا رہا ہے؟

براعظم کو مل کر محفوظ رکھنے کا مشن بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ ٹرمپ کی پالیسیاں یورپ کی اندرونی خرابیوں کو غیر معمولی حد تک بے نقاب کرتی رہیں گی۔

اکیسویں صدی کے امریکا کو یورپ کی ضرورت نہیں اور وہ قوم پرستانہ یا نسل پرستانہ سیاست اور پالیسیوں کے ہاتھوں پیدا ہونے والی اندرونی تقسیم سے یورپ کو بچانے کے لیے کوئی بھی کردار ادا کرنے میں کچھ خاص دلچسپی نہیں لے گا۔

اس تلخ حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یورپی قائدین اور اقوام دونوں ہی اپنے حصے کا کام کرنے کے لیے اچھا خاصا وقت لے چکے ہیں یا ضائع کر چکے ہیں۔ یورپ نے انتہائی درجے کی غفلت کا مظاہرہ کیا ہے اور اس کے لیے اُس سے اب ہمدردی کا اظہار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آج ڈونلڈ ٹرمپ اگر یورپ کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھانے کی پوزیشن میں ہیں تو اس کے لیے خود یورپ کے سوا کوئی قصوروار نہیں۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"With Trump elected, Quo Vadis Europe?"
("The Globalist". November 19, 2024)

بچّوں کو موبائل کی لت سے کیسے بچایا جائے؟

Becky Kennedy

ہم سب فون، سوشل میڈیا اور نوجوانوں کی ذہنی صحت کے بارے میں مختلف ڈیٹا دیکھتے ہیں کہ بچوں کی اس نسل میں اینزائٹی اور ڈپریشن کی شرح بہت زیادہ ہے۔ میں بھی ہر ایک کی طرح اس معاملے میں بہت فکرمند ہوں اور ایک بنیادی چیز کے حوالے سے حیران ہوں جو ہماری زندگی میں بنیادی اور اصولی ہے لیکن ہم اس پر توجہ نہیں دیتے۔ اور وہ چیز ہے حدود (Boundaries)۔

کلینیکل سائیکولوجسٹ اور پیرنٹنگ اور خاندانی تعلقات میں متخصص کی حیثیت سے میں نے غور کیا ہے کہ ہم نے ان اہم حدود کو تج دیا ہے جو بچوں کو خوش رکھتی ہیں۔ معاملہ یہ ہے کہ بچے ہمیشہ اپنی حدود سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ کچھ بھی کرنا چاہتے ہیں جو ان کے لیے بہتر نہیں۔

دراصل یہ بچوں کے کام کا حصہ ہے، کیونکہ بچے آخری حد تک جا کر اپنی دنیا کو کھنگالنا چاہتے ہیں اور جب بچے یہ کام کرتے ہیں تو اس دوران والدین بھی واقعتاً مشکل میں ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں خاندانی نظام عدم توازن کا شکار ہوتا ہے اور ذہنی صحت خراب ہوتی ہے۔

بچوں کے ساتھ حدود کا تعین نہ کرنے کی جتنی زیادہ قیمت آج کے دور میں ادا کرنی پڑسکتی ہے، اتنی پہلے کبھی نہ تھی۔ عشروں پہلے، اگر والدین ان حدود کو قائم کرنے اور بچوں کو ان کی حدود میں رکھنے میں ناکام ہوتے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ بچوں کو اضافی کپ کیک مل جاتا یا وہ کچھ زیادہ دیر باہر رہتے۔ آج بچوں کے ساتھ ان حدود کا تعین نہ کر پانے کی قیمت یہ ہوتی ہے کہ آٹھ برس کا بچہ آزادانہ ٹک ٹاک دیکھتا ہے یا گھنٹوں ویڈیو گیم کھیلتا رہتا ہے۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ ہم ایک بحران سے گزر رہے ہیں، لیکن یہ بحران محض فون اور سوشل میڈیا کا نہیں ہے۔ میں اس کے ساتھ ایک اور بحران دیکھ رہی ہوں، جسے میں ''مضبوط قیادت'' کا بحران کہتی ہوں جس کی ضرورت ہمارے بچوں کو پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔

مضبوط قیادت (Sturdy Leadership) سے میری مراد کیا ہے؟ مضبوط قیادت والدین کی اتھارٹی کا ایک ماڈل ہے جہاں ماں اور باپ، دونوں حدود کا خیال رکھتے ہیں اور بچے کے ساتھ مربوط رہتے ہیں۔ وہ اپنے بچے کے احساسات کا خیال بھی رکھتے ہیں اور اسی دوران ہر ایک کے لیے قابلِ قبول ماحول بھی برقرار رکھتے ہیں۔ یہ ماڈل کام کی جگہ یا کھیلوں کی ٹیم (اسپورٹس ٹیم) میں بھی موثر ہے۔ ایک ایسا لیڈر جو اپنے اصولوں میں کھرا ہوتا ہے اور دیگر لوگوں کے احساسات کا بھی خیال رکھتا ہے تاہم ان کے زیرِ اثر نہیں آتا۔

تو پھر، اس پر عمل کیسے کیا جائے؟ تصور کیجیے کہ آپ کا پانچ سالہ بچہ کھلونوں کی دکان پر ایک کھلونا خریدنا چاہتا ہے، حالانکہ آپ اسے پہلے ہی صاف صاف یہ بتا چکے ہیں کہ آپ صرف اس کے ایک کزن کی سالگرہ کا تحفہ خریدنے کے لیے کھلونوں کی دکان پر جا رہے ہیں۔ آپ کا پانچ سالہ بچہ کھلونے کی ضد شروع کر دیتا ہے اور آپ کو غصہ آنے لگتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں مضبوط قیادت کا اظہار کچھ اس طرح ہوگا: ''مجھے معلوم ہے کہ اتنے ڈھیر سارے کھلونے دیکھ کر ایک بھی کھلونا نہ لینا کتنا مشکل ہے۔ لیکن آج ہم صرف آپ کے کزن کے لیے کھلونا لینے آئے ہیں۔ چلو، تمہیں جو کھلونا چاہیے، اس کی تصویر لے لیتے ہیں، تاکہ بعد میں وہ ہمیں یاد رہے اور ہم اسے خرید سکیں۔''

آپ اسے ریاضی کے سوال کی طرح سمجھ سکتے ہیں یعنی احساسات کی توثیق (تسلیم) + حدود کا تعین = مضبوط قیادت۔

اگر بچہ بڑا ہو تو کیا ہوگا؟ تصور کیجیے جب آپ کی بارہ سالہ بچی نے کسی دوست کے گھر پر رہنے کا پوچھا تو آپ نے جھٹ اسے منع کر دیا جس پر وہ آپ پر غصہ ہوئی اور یہ سمجھی کہ وہ جو چاہتی ہے، آپ اسے اس سے روک رہے ہیں۔ اس لمحے مضبوط قیادت کا اظہار یہ کہہ کر بھی ہوسکتا ہے کہ ''میری ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ میں وہ فیصلہ کروں جو میری نظر میں آپ کے لیے بہتر ہے، چاہے وہ آپ کو برا لگے۔ آپ کی یہ فرمائش بھی ایسی ہی ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ آپ ناخوش ہیں اور میں اسے سمجھتا ہوں۔'' اس مثال میں، والد نے اپنی بچی کے احساسات کو قبول کیا اور ساتھ ہی وہ اپنی بچی کے لیے جو بہتر سمجھتا تھا، اپنے اس فیصلے پر قائم رہا۔

حدود کا تعین، ابتدا سے اور اکثر کیوں اہم ہے؟ جب ہمارے بچے اس عمر کو پہنچتے ہیں کہ وہ ہم سے فون یا انسٹاگرام مانگیں تو والدین کی حیثیت سے ہمارا رویہ عالمی طور پر تسلیم شدہ ''میڈیا پالیسی'' سے مختلف نہیں ہوگا۔ ہمارا رویہ اسی برتاؤ کی توسیع ہوگا جیسا ہم ہمیشہ اپنے بچوں کے ساتھ ان کی خواہشوں پر اختیار کرتے چلے آئے ہیں۔

میں حدود کو بہت پسند کرتی ہوں اور میں اس خیال کی بہت بڑی مداح ہوں کہ کسی کام کو کرنے میں کبھی اتنی تاخیر نہیں ہوتی کہ پھر اسے کیا ہی نہ جائے۔ تبدیلی کا درست وقت ہمیشہ 'ابھی' ہوتا ہے چنانچہ اگر آپ ان والدین میں سے ہیں جو پہلے سے اپنے بچوں کو فون دیتے آرہے ہیں یا سوشل میڈیا تک ان کی رسائی ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ اب انہیں اس سے روکیں تو پانی ابھی سر سے نہیں گزرا۔

آپ خود کو ہوائی جہاز کے ایسے پائلٹ کے طور پر تصور کریں جو پرواز کے بعد آسمان پر طوفان کے آثار دیکھتا ہے تو اس کے پاس ہمیشہ یہ اختیار ہوتا ہے کہ ہوائی جہاز کو واپس ایئرپورٹ پر اتار لے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض مسافر برا ماننے کے باوجود پائلٹ سے یہی چاہیں گے۔ آپ اپنی فیملی کے ہوائی جہاز کے پائلٹ ہیں اور اپنے ضابطے بدلنے پر اگرچہ آپ کے بچے اس وقت ضرور برا منائیں گے، لیکن آپ کے فیصلے اور تحفظ کے اقدامات سے ان کا فائدہ ہی ہوگا۔

اصل نکتہ چھوٹے چھوٹے اقدامات سے آغاز کرنا ہے۔ مثال کے طور پر، آپ کچھ اس قسم کی گفتگو سے اپنے بچے سے شروعات کر سکتے ہیں کہ ''میں فون، سوشل میڈیا اور آپ کی صحت کے بارے میں بہت سی چیزیں پڑھ رہا ہوں اور میں آپ کی صحت اور تحفظ کا ذمہ دار ہوں۔ مجھے معلوم ہے، یہ آسان نہیں، لیکن آج سے جب سونے کے لیے لیٹیں گے تو ہم اپنا فون بیڈروم سے باہر رکھیں گے''۔ اس مثال میں، والد حدود کے ساتھ اپنی اتھارٹی کا اظہار کر رہا ہے، اور یہ بھی بتا رہا ہے کہ نیا ضابطہ تحفظ کے لیے ہے، نہ کہ سزا کے طور پر۔

میرا کام والدین کو پُراعتماد اور مضبوط لیڈر بنانا ہے تاکہ وہ پُراعتماد، مضبوط بچے پروان چڑھا سکیں۔ ہم جانتے ہیں کہ فون اور سوشل میڈیا ہمارے بچوں کے پھلنے پھولنے کی صلاحیت محدود کر رہے ہیں، لیکن والدین کو بھی زیادہ تعاون کی ضرورت ہے۔ ہمیں اس گفتگو کو مزید بڑھانے کی ضرورت ہے تاکہ والدین خود میں قید رہنے کے بجائے ان عملی مہارتوں کو جانیں جو وہ اپنے بچوں کو بدلنے اور ان کی مدد کرنے کے لیے اختیار کر سکتے ہیں۔

(ترجمہ: سید عرفان احمد)

"The thing that's missing from our conversations about kids and phones". ("Time". October 24, 2024)

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950